تدبّر

لاہور

جاری کردہ:

مولانا امین احسن اصلاحی

مدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

قرآن حکیم

- نفیس کتابت
- سلیس ترجمہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ
- حاشیہ مشتمل بر اخذ و تلخیص از تفسیر تدبر قرآن: خالد مسعود
- سفید زمین اور نئے حاشیہ کے ساتھ عمدہ طباعت
- خوبصورت جلد اور کور
- سائز: 20x30/8 صفحات 1008 قیمت 550 روپے

ناشر: فاران فاؤنڈیشن 122 فیروز پور روڈ لاہور

تدبر حدیث

(جلد اول)

شرح مؤطا امام مالکؒ — مولانا امین احسن اصلاحیؒ

(کتاب الزکوۃ، البیوع، الاقضیۃ، الحدود، الاشربۃ، العقول، الجامع وغیرہ سے منتخب ابواب)

- ترتیب و تدوین: خالد مسعود، سعید احمد
- فہم حدیث کا ایک نیا انداز
- مالکی فقہ کی آراء کا محاکمہ
- خوبصورت طباعت و جلد بندی
- سائز: 20x30/8 صفحات 544
- قیمت: 350 روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث، رحمان سٹریٹ مسلم روڈ سمن آباد لاہور

تدبّر

لاہور

جاری کردہ

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

شمارہ 74

دسمبر 2001ء

شوال 1422ھ

مجلس ادارت

عبداللہ غلام احمد (مدیر مسئول)

محبوب سبحانی

سعید احمد

سید اسحاق علی

قیمت 12.50 روپے

سالانہ 50.00 روپے

بیرون ملک 250.00 روپے

(ماسوائے برصغیر)

فہرست

تذکرہ و تبصرہ

انتم الاعلون ان کنتم مومنین / عبداللہ غلام احمد — 3

تدبر قرآن

تفسیر نظام القرآن: سورۂ بقرہ / حمید الدین فراہیؒ — 11

تدبر حدیث

درس صحیح بخاری / امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی — 22

درس موطا امام مالک / امین احسن اصلاحی / ماجد خاور — 37

مقالات

رسول اللہؐ کی مخالفت میں قریش کی منصوبہ بندی / خالد مسعود — 44

مراسلہ و مذاکرہ

کیا سیکولر ریاستوں سے ہجرت کر جانا مناسب ہے؟ / امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی — 53

ناشر: ادارہ تدبر قرآن و حدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور

عبداللہ غلام احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انتم الاعلون ان کنتم مؤمنین

مسلمان تمام عالم کی آبادی کا کم و بیش ایک چوتھائی حصہ ہیں۔ مسلم ممالک کی تعداد ۵۶ ہے۔ ان ممالک میں [illegible] یا بالواسطہ مسلمانوں ہی کی حکومتیں قائم ہیں۔ یہ ممالک قدرتی وسائل کی دولت سے مالا مال ہیں۔ افرادی قوت، ذہانت اور صلاحیت کی کوئی کمی نہیں۔ ان ممالک کے عوام کو اسلام سے والہانہ محبت بھی ہے اور اس کے لیے جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ ان میں دینی اور ملی جذبہ بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس کے باوجود مسلمان ہر طرف کمزور اور بے حیثیت ہیں۔ معاشی اعتبار سے دنیا بھر کی اقوام میں سب سے نچلے درجے پر ہیں۔ سیاسی طور پر ان کی کوئی ساکھ ہے نہ دفاعی طور پر خود کفیل ہیں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے غیر مسلم اقوام کے دست نگر ہیں۔ مغربی ذرائع ابلاغ عالم اسلام کو اہانت اور تمسخر کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں اور طاغوتی قوتیں مسلمانوں کو ہر طرف سے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔

ماہ ستمبر میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر نیویارک اور پینٹاگن کے انہدام کے فوراً بعد امریکہ نے بغیر تحقیق کے ایک ہی سانس میں اسامہ بن لادن، اس کی تنظیم القاعدہ اور ان کو پناہ دینے والی طالبان کی اسلامی حکومت کو گردن زدنی قرار دے دیا اور دہشت گردی کا قلع قمع کرنے کا بہانہ بنا کر مصیبت زدہ، کمزور اور مفلوک الحال افغانستان پر یورش کر دی۔ ہزاروں ٹن بارود برسایا اور پورے ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ افغانستان کے نہتے، بدحال اور جنگ سے تھکے ہارے ہزاروں معصوم بوڑھے، بچے اور عورتیں امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی Daisy Cutter Bombs اور Carpet Bombing کا لقمہ بنے اور لاکھوں کی تعداد میں بے خانماں ہوئے۔ جو لوگ ہجرت نہ کر سکے وہ اس وقت خوفناک بھوک اور شدید سردی سے دوچار ہیں۔ یہ صرف اس لیے ہوا کہ وہاں ایک ایسی حکومت قائم ہو گئی تھی جس نے اسلام کو اپنا شعار ٹھہرا لیا تھا۔ امریکہ کی اس کارروائی نے بظاہر طالبان کو پسپا کیا ہے لیکن اس کا اصل ہدف اسلام ہے جس کے خلاف امریکہ کے صدر لاشعوری طور پر صلیبی جنگ کا نہ صرف اعلان کر چکے ہیں بلکہ بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ افغانستان میں کام مکمل ہونے کے بعد دوسرے ممالک میں بھی کارروائی ہو گی۔ جن ممالک کی نشاندہی کی جا رہی ہے وہ سب کے سب مسلمان ممالک ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے وعدہ فرمایا ہے کہ "پست ہمت نہ ہو اور غم نہ کرو۔ اگر مومن ہو تو

تمہیں غالب رہو گے"۔ (آل عمران: ۱۳۹) بلاشک اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا اور پکا ہے۔ مسلمان اگر دنیا میں رسوا ہو رہے ہیں تو اس کی وجہ ان کا اس وعدہ کی شرط سے انحراف ہے۔ یہ انحراف کہاں کہاں ہو رہا ہے؟ اس کے بارے میں خود احتسابی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ مسلم امہ کو اگر اس عالم میں باعزت طور پر زندہ رہنا ہے تو اسے عالمی، ملکی اور انفرادی تینوں سطحوں پر اپنی کوتاہیوں اور خامیوں کا جائزہ لینا اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل مرتب کرنا ہوگا۔

مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصرت کی بشارت دینے والی یہ آیہ کریمہ جنگ احد کے بعد نازل ہوئی۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی اور اطمینان دلاتے ہوئے فرمایا کہ تم احد کے حادثہ سے دل شکستہ اور پست ہمت نہ ہو، حق و باطل کی کشمکش میں غالب اور سربلند تم ہی رہو گے بشرطیکہ تم سچے اور پکے مومن بن جاؤ۔ اس آیہ کے نزول کے وقت حالات یہ تھے کہ احد کی شکست سے کمزور قسم کے مسلمانوں کے دلوں پر شکستگی طاری ہوئی۔ اس سے بہت سے ذہنوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام کے لیے فتح اور غلبہ کی جو بشارتیں سنائی جاتی رہی ہیں وہ بس یوں ہی خالی خولی باتیں تھیں، مقصود اس سے صرف دھاک بٹھانا اور لوگوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اب ساری حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے۔ اس وقت کے منافقین اور مخالفین نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس خیال کو خوب ہوا دی تاکہ مسلمانوں کو اسلام کے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس کر دیں۔ قرآن مجید نے اس آیہ میں اس زہریلے پراپیگنڈہ کا رد کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس جنگ میں جو افتاد تمہیں پیش آئی ہے اس سے مرعوب اور خوف زدہ ہو کر ہمت نہ ہارو۔

اگرچہ طالبان کا صحابہ کرامؓ سے موازنہ کرنا صحیح نہیں تاہم اس گئے گزرے دور میں احیائے اسلام کے لیے ان کی قربانیوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ طالبان نے مقدور بھر باطل کا مقابلہ ان حالات میں کیا جب دنیا کی تمام طاغوتی قوتیں ان کے خلاف متحد ہو گئیں اور مسلم ممالک کی حکومتوں نے امریکہ کے خوف کے مارے منقار زیر پر کر لی۔ کسی کو احتجاج یا مذمت کرنے کی جرأت نہ ہوئی بلکہ بعض مسلم ممالک کی حکومتوں نے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کی، چنانچہ طالبان کو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ ان کی اس پسپائی نے دنیا بھر کے مسلمانوں پر افسردگی اور شکستگی طاری کر دی ہے جبکہ طاغوتی قوتوں کے ذرائع ابلاغ اسلام کی تضحیک اور مسلمانوں کا تمسخر اڑا رہے ہیں۔ ان حالات میں لازم ہے کہ امت مسلمہ اس آیہ کریمہ سے رہنمائی حاصل کرے۔ اس میں مسلمانوں کو ہدایت فرمائی گئی ہے کہ وہ وہن میں مبتلا نہ ہوں، پست ہمت نہ ہوں اور غم نہ کریں اور ساتھ ہی یہ شرط بتائی ہے کہ وہ پکے اور سچے مومن بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ سنت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے تاکہ ان کی کمزوریاں دور

ہوں اور وہ خدا کی تائید و نصرت کے زیادہ سے زیادہ سزاوار ہوں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر اور اس کے فضل و عنایت کی ایک شکل ہے۔ مسلم امہ کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار انتباہ سے نصیحت پکڑے، توبہ استغفار کرے، اپنی اصلاح کرے، ہمت سے کام لے اور از سر نو اپنی راہ متعین کرے۔ انشاءاللہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہمرکاب ہوگی۔

"وھن" کے معنی ضعف کے ہیں، عام اس سے کہ یہ عمل کا ہو یا ارادہ کا، جسم کا ہو یا کردار و اخلاق کا۔ ایک حدیث مبارکہ میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تم سیلاب کے خس و خاشاک کی مانند ہو جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! اس کا سبب کیا ہوگا؟ آپ نے فرمایا: تمہارے اندر 'وھن' پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے پوچھا: یارسول اللہ! وھن کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا: حب الدنیا و کراھیة الموت (دنیا کی محبت اور موت سے ناگواری) گویا عزم و حوصلہ اور عمل و ارادہ کی وہ پستی جو دنیا کی زندگی کی محبت اور موت کے خوف سے پیدا ہوتی اور مسلمانوں کو جہاد سے روکتی ہے وہ وھن ہے۔ مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اس میں مبتلا نہ ہوں۔

سورہ آل عمران کی آیت ۱۳۹ میں 'غم نہ کرو' کی ہدایت کے لیے لا تحزنوا کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ حزن سے مراد عام رنج و غم نہیں ہے جو کسی موقع کے ضائع ہو جانے یا نقصان پہنچ جانے پر فطرتاً ہو جایا کرتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ مایوسی اور دل شکستگی ہے جو انسان کے عزم و حوصلہ کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ مسلمانوں سے خطاب ہے کہ وہ اپنے اندر مایوسی اور شکستگی پیدا نہ ہونے دیں بلکہ اس کو پیدا کرنے والے اسباب پر غور کریں اور ان کو دور کریں تاکہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی نصرت کے حق دار بنائیں۔ احد کی شکست سے جو لوگ بددل ہوئے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تمہارا یہ گمان تھا کہ حق کی راہ خطرات اور آزمائشوں سے خالی ہے اور تم اسلام کا دعویٰ کر کے ٹھنڈی سڑک سے سیدھے جنت میں جا براجو گے تو تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ خدا کی جنت میں کوئی شخص اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک کہ امتحان سے یہ متعین نہ ہو جائے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کا ولولہ رکھتا ہے یا نہیں اور حق کے لیے آزمائشوں کی تاب لا سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اس جانچ کے لیے تمہیں احد کی آزمائش پیش آئی۔

مسلمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا وعدہ یہ نہیں ہے کہ وہ جو روِیہ بھی چاہیں اختیار کریں خدا کی نصرت ہر حال میں انہیں حاصل رہے گی، بلکہ یہ مشروط ہے اس شرط سے کہ مسلمان ادائے فرض میں ڈھیلے نہ پڑیں، اطاعت امر میں اختلاف نہ کریں، خدا اور رسول کی نافرمانی نہ کریں اور آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے طالب نہ بنیں۔ اس وقت امت مسلمہ پر جو افتاد پڑی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہے کہ ہم اپنا

احتساب کریں، اپنے اندر سے کمزوریاں دور کریں، مخالفین اسلام کے پراپیگنڈے سے متاثر ہو کر، بد دل ہو کر، ہمت نہ ہار بیٹھیں بلکہ از سرِ نو کمر بستہ ہو کر حق کی سربلندی کے لیے سینہ سپر ہو جائیں تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و نصرت کی امید کی جا سکتی ہے۔ موجودہ حالات میں مسلم امہ کو کیا کرنا چاہیے؟ اس سلسلہ میں آئندہ سطور میں چند اشارات دیے جا رہے ہیں:

۱۔ سچا اور پکا مومن بننے کے لیے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کامل اور پختہ ایمان ہو۔ اسے ہی اپنا خالق، رازق، مالک، مقتدر اور کارساز مانا جائے۔ اسی سے ڈرنا چاہیے اور اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ باطل سے مرعوب ہو کر حق کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیونکہ حق کا بول بالا ہو کر رہتا ہے۔ انسانی فطرت میں باطل کی کوئی بنیاد نہیں ہے۔ یہ خودرو جھاڑیوں کی طرح اس وقت پھیلتا ہے جب اس کو صاف کرتے رہنے والے موجود نہیں ہوتے۔ جب اس کو صاف کرنے والے آ موجود ہوتے ہیں تو حالات کے اعتبار سے انہیں مشقت اٹھانی پڑتی ہے لیکن بالآخر باطل نابود ہو کے رہتا ہے اور اس کی جگہ کشتِ حق لہلہا اٹھتی ہے۔

۲۔ اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی مانگی جائے اور خالص توبہ کر کے مصمم ارادے کے ساتھ اصلاح کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی اطاعت ثابت قدمی سے کی جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت نصیب ہو۔ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول اور اہل ایمان کو دوست بناتے ہیں وہی اللہ کی جماعت ہیں اور وہی غالب ہونے والے ہیں۔

۳۔ شریعت اسلامی کے نفاذ ہی میں انسانوں کی فلاح ہے۔ مسلمان ممالک کے عوام اپنے لیڈروں، سیاستدانوں اور حکمرانوں کو مجبور کریں کہ وہ ان کے ملکوں میں اللہ اور رسول کا دیا ہوا نظام ٹھیک ٹھیک سے نافذ کریں۔ بدقسمتی سے اس وقت مسلم ممالک کے حکمران زیادہ تر طاغوتی قوتوں کے گماشتے ہیں۔ وہ نہ صرف نفاذ اسلام کے مخالف ہیں بلکہ وہ مسلم امہ کے وسائل بڑی بے دردی سے ذاتی عیش و عشرت پر صرف کر رہے ہیں۔ اسلامی نظام کا نفاذ حکمت اور تدریج کے ساتھ ہونا چاہیے۔ روشن خیالی کے زعم میں شریعت اسلامی کی تضحیک کی جائے نہ معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا جائے۔

۴۔ وطنی قومیت یا وطنیت بجائے خود بری چیز نہیں لیکن اعتدال ملحوظ نہ رہے تو یہ فساد اور گروہ بندی کا موجب بنتی ہے۔ یہ لازم ہے کہ جہاں کہیں وطنی مفاد اور مسلم امہ کے مفاد میں تصادم پیش آئے امت مسلمہ کے مفاد کو ترجیح دی جائے۔

۵۔ عرب اور غیر عرب مسلمانوں کی تفریق ختم کی جائے۔ سب مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ ایک

مسلمان ملک پر مشکل آ پڑتی ہے تو دوسرے تمام مسلمان ممالک کو اس کی حمایت اور مدد کرنی چاہیے۔ ایک مسلمان ملک کے دشمن کو سب مسلمان ممالک کا دشمن تصور کیا جائے۔ ایک مسلمان ملک اگر غلط راہ اختیار کرتا ہے تو دوسرے مسلمان ممالک اسے صحیح راہ پر چلنے پر مجبور کریں۔ اگر دو برادر مسلمان ممالک کے درمیان تنازع کھڑا ہو جائے تو دوسرے مسلمان ممالک کا فرض ہے کہ وہ مل کر اس تنازع کے حل کے لیے کوشش کریں۔ یہ سب کچھ صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ مسلم امہ میں کامل اتحاد، یک جہتی اور متفقہ لائحہ عمل کا احساس موجود ہو۔

۶۔ مسلمان اپنی فوجی قوت کو نفری کے اعتبار سے بھی اور اسلحہ اور اسباب جنگ کے اعتبار سے بھی زیادہ سے زیادہ بڑھائیں تاکہ اللہ اور ان کے دشمنوں پر ان کی دھاک اور ہیبت قائم رہے اور انہیں نرم چارہ سمجھ کر ان پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کریں۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمان غلامی، بےچارگی، مایوسی، بےعملی، جہالت، اقتصادی بدحالی، سیاسی ابتری اور خوف سے دوچار ہیں۔ اس کی بنیاد ان کی کمزوری ہے۔ اور

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

حالانکہ بیشتر مسلمان ممالک قدرتی وسائل سے مالا مال ہیں۔ ان کی افرادی قوت بھی وافر ہے اور ذہنی استعداد کی بھی کمی نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ تمام وسائل کو یکجا کیا جائے۔ دولت مند ممالک مال پیش کریں۔ جن کے پاس افرادی قوت ہے وہ اسے متحرک کریں اور جن کے پاس ذہنی استعداد ہے وہ اس کو بھرپور طریقے سے استعمال میں لائیں اور اس کی قدر کریں۔ اس دور میں جنگ تیر و تفنگ کی نہیں بلکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ہے۔ دشمن سے مقابلے کے لیے اس کے برابر بلکہ اس سے برتر سامان جنگ کا حصول لازمی ہے۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ مسلمان ممالک اپنی حفاظت کے لیے اسلحہ اور سامان جنگ بھی اپنے مخالفوں سے خریدنے پر مجبور ہیں اور یہ مخالف انہیں سامان جنگ دینے پر نخرے کرتے ہیں۔ اگر دینے پر راضی ہوتے بھی ہیں تو نہایت گھٹیا اور از کار رفتہ سامان بھاری قیمت پر اور ذلت آمیز شرائط پر فروخت کرتے ہیں۔ دولت مند مسلم ممالک پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ ماڈرن ٹیکنالوجی حاصل کریں اور ہر طرح کی مشینری اور سامان جنگ خود تیار کریں۔ جب تک یہ نہیں ہو گا مسلمان غیر اقوام کے زیرِ نگیں رہیں گے۔

۷۔ اکثر مسلم ممالک معاشی بدحالی میں مبتلا ہیں اور غیر ملکی قرضوں میں گردن تک ڈوبے ہوئے ہیں۔

اس وقت صورت حال یہ ہے کہ بعض مسلم ممالک قرض پر سود ادا کرنے کے لیے مزید قرضوں کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ قرض خواہ ممالک اور ادارے نہ صرف ان کی تضحیک کرتے ہیں بلکہ انہوں نے ان کو اپنا دست بستہ غلام اور تابع مہمل بنا رکھا ہے۔ حال ہی میں امریکہ نے افغانستان میں بدترین دہشت گردی کی ہے جس کی مثال نہیں ملتی اور یہ دہشت گردی اب تک جاری ہے۔ کسی مسلمان حکومت کو جرأت نہیں ہوئی کہ وہ دبی زبان ہی سے اس کی مذمت کر دیتا۔ یہ سب قرض کا کیا دھرا ہے۔ مسلم امہ کی کمزوری کی اصل وجہ قرض ہی ہے۔ لازم ہے کہ قرض کی لعنت سے خلاصی حاصل کی جائے۔ لیکن یہ کام اتنا آسان نہیں۔ اس کے لیے قربانیاں دینی ہوں گی۔ کفایت شعاری اختیار کرنی ہوگی۔ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے ہوں گے۔ اجتماعی اور انفرادی سطح پر اوپر سے نیچے تک بددیانتی اور عیش وعشرت کو خیر باد کہنا ہوگا۔ نام نہاد معیار زندگی کی بلندی کی بے لگام دوڑ کو ختم کرنا ہوگا۔ اپنے وسائل کو بہتر منصوبہ بندی سے بروئے کار لانا ہوگا۔ اب تک جو قرضے لیے گئے ہیں ان کو پرایا دھن سمجھ کر اڑانے سے اجتناب کرنا ہوگا۔

۸۔ مسلم ممالک تعلیم اور ہنر کے میدان میں پس ماندہ ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی صف میں کھڑا ہونے اور اپنا سر اونچا رکھنے کے لیے تعلیم پر توجہ دینا ہوگی۔ افسوس کہ تعلیم کی ضرورت پر تقریریں اور سیمینار تو بہت ہوتے ہیں لیکن ان پر خرچ بہت کم کیا جاتا ہے۔ نظام تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے۔ ایسا نظام تعلیم تشکیل دینا ہوگا جو اسلامی اقدار سے ہم آہنگ ہو اور مادی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی اور اخلاقی ترقی کا بھی ضامن ہو۔

۹۔ ذرائع مواصلات، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے دنیا اب ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ اس میں الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں۔ ملت اسلامیہ اور دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان رابطہ نہ صرف سیاسی، معاشی اور فنی مقاصد کے حصول کے لیے ناگزیر ہے بلکہ اسلام کی اشاعت کے لیے بھی ایک اہم واسطہ ہے۔ اس لیے غیر مسلم اقوام سے تعلقات رکھنا ضروری ہے مگر ہر قدم پر ملت اسلامیہ کا مفاد پیش نظر رہنا چاہیے۔ سیاسی اور دفاعی مصلحتوں کے تحت غیر مسلم ملکوں سے دوستی اور حلف کے معاہدے کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سامنے رہنا چاہیے: ''اے ایمان والو! مسلمانوں کے مقابل میں کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرالو'' (النساء: ۱۴۴)۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے روگردانی اس کے قہر کو دعوت دینا

اور اپنے آپ کو اس کی تائید ونصرت سے محروم کرنا ہے۔

۱۰۔ سب کے سب مسلمان ایک اللہ، ایک رسول اور ایک ہی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ قرآن وحدیث کی تفسیر وتعبیر اور فقہی استنباط میں فروعی اختلافات کا پیدا ہونا فطری بھی ہے اور اس کی گنجائش بھی ہے لیکن اس قسم کے اختلافات کو ہوا دے کر اس حد تک لے جانا کہ فساد فی الارض برپا ہو جائے اور مسلم امہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے دانشمندی نہیں۔ اسلام ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا۔ مختلف مسلک رکھنے والے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایک دوسرے کی بات سننے، سمجھنے اور برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ فرقہ وارانہ تشدد اور فسادات نہ صرف مسلمانوں کو کمزور کر رہے ہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی تضحیک کا باعث بن رہے ہیں اور دشمنوں کو رخنہ اندازی کا موقع فراہم کر رہے ہیں۔ صرف پاکستان میں پچھلے چند سالوں میں سینکڑوں مسلمان فرقہ وارانہ تشدد کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں مسلم امہ کے علماء اور مذہبی رہنماؤں کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کریں اور لوگوں کو محبت، اخوت اور برداشت کا سبق دیں۔

۱۱۔ مغربی ذرائع ابلاغ نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کی غلط تصویر پیش کر رہے ہیں بلکہ ان کا رویہ نہایت توہین آمیز ہے۔ مسلمانوں کے پاس اپنا کوئی مؤثر میڈیا نہیں جو اس پراپیگنڈے کا جواب دے سکے۔ مسلمان ممالک کے اپنے اپنے کمزور اور ناقص میڈیا تو ہیں مگر زیادہ تر اسلامی آئیڈیالوجی سے عاری ہیں۔ ان کا کام محض تفریح، اشتہار بازی اور مغربی میڈیا کی نقالی ہے۔ مسلم ممالک کو باہمی اشتراک سے ایک ایسا مضبوط اور موثر میڈیا قائم کرنا چاہیے جو مغربی میڈیا کا منہ توڑ جواب دے سکے اور اپنے عوام کو ان کے اسلام دشمن اور مخرب اخلاق پراپیگنڈہ سے محفوظ رکھ سکے۔ کسی ایک ملک کے لیے ایسا میڈیا اکیلے قائم کرنا ممکن نہیں اس لیے دولت مند مسلم ممالک کو اس عظیم منصوبے کے لیے میدان میں اترنا چاہیے۔

۱۲۔ تنظیم اسلامی کانفرنس (O.I.C) جو مسلم امہ کے اجتماعی مفادات کے تحفظ اور مختلف مسلم ممالک کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کے وسیع تر مقاصد کے لیے تشکیل دی گئی تھی، اپنی افادیت کھو چکی ہے۔ امریکہ نے دہشت گردی کی آڑ لے کر افغانستان کے معصوم عوام پر جو ظلم وستم کے پہاڑ توڑے ہیں اور مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے خون کی ندیاں بہا رہا ہے اس کے بارے میں ۵۶ مسلم ممالک کی اس تنظیم کا رویہ نہایت مایوس کن رہا ہے۔ کشمیر اور فلسطین میں نصف صدی سے

زیادہ عرصہ سے مسلمانوں کی نسل کشی جاری ہے مگر اس ادارے نے اس کے بارے میں خاموشی اختیار کر رکھی ہے۔ اس ادارہ کا کردار وقتاً فوقتاً اجلاس بلانے اور نشستند و خوردند و برخاستند تک محدود نہیں رہنا چاہیے۔ اسے اس مصلحت کیش رویہ پر نظر ثانی کرنی چاہیے اور اس کے ممبر ممالک کو اپنے انفرادی مفادات اور اختلافات سے بالاتر ہو کر اپنی ذمہ داریاں پوری کرنی چاہئیں۔ ادارے کا کردار مؤثر اور فعال ہونا چاہیے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر مسلم ملک عالم اسلام کے مسائل کو اپنے مسائل تصور کرے اور ان کے حل کے لیے مخلص اور سنجیدہ ہو۔ عرب لیگ کا کردار بھی حوصلہ افزا نہیں۔ کسی بھی عرب حکومت میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ عالم اسلام کو اکٹھا کر کے اسرائیل کو آنکھیں دکھا سکے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ عرب لیگ اپنی سرگرمیوں کو صرف عربوں تک محدود نہ رکھے بلکہ تمام عالم اسلام کے ساتھ اشتراک کر کے اپنے کردار کو زیادہ مؤثر بنائے۔ بہتر ہو گا کہ عرب لیگ اور تنظیم اسلامی کانفرنس کو آپس میں ضم کر کے ایک ایسا ادارہ تشکیل دیا جائے جو زیادہ مضبوط، با اختیار، فعال اور موثر ہو تا کہ وہ مسلمانوں کے مفادات کی مناسب حفاظت کر سکے کیونکہ اقوام متحدہ کا عالمی ادارہ اب صرف امریکہ کے مفادات کی حفاظت تک محدود ہو گیا ہے۔ اس سے بھلائی اور انصاف کی امید عبث ہے۔

۱۳۔ مسلمان ممالک کے اندر بے شمار غیر حکومتی تنظیمیں (NGO'S) زندگی کے مختلف شعبوں میں کام کر رہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر تنظیمیں نہایت مفید کام کر رہی ہیں البتہ کچھ تنظیمیں ایسی بھی ہیں جو اسلام دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ وہ مسلمانوں کو غیر شعوری طور پر اسلامی تعلیمات سے بدظن اور متنفر کر رہی ہیں، معاشرے میں منافرت پھیلانے اور اسلامی اقدار کو سبوتاژ کرنے کے لیے مختلف حربوں سے کام لے رہی ہیں۔ ایسی تنظیموں پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان حکومتوں کو ان کے بارے میں چشم پوشی اور اغماض سے کام نہیں لینا چاہیے۔

امام حمید الدین فراہیؒ
ترجمہ: ڈاکٹر عبید اللہ فراہی

تفسیر نظام القرآن: سورہ بقرہ

عنوانات:

(۱) مقدمہ (۲) الفاظ (۳) نحو (۴) بلاغت
(۵) تاویل (۶) تدبر (۷) نظم

جہاں تک تفسیر کے مقدمہ کا تعلق ہے اس میں سورہ کے کلی اور بنیادی امور جیسے عمود، سورہ کے مطالب، شان نزول، خطاب کی جہتوں اور اجزاء سورہ کی ترتیب سے بحث کی گئی ہے۔

الفاظ کی فصل میں لفظوں کے معانی، ان کی اصل حقیقت اور صورت و ہیئت سے تعرض کیا گیا ہے اور استدلال کے لیے ہم نے قرآن مجید اور کلام عرب کو پیش نظر رکھا ہے۔

نحو کے باب میں الفاظ کی ترکیب زیر بحث آئی ہے اور اس سلسلہ میں نظائر اور حسن تاویل سے استدلال کیا گیا ہے۔

بلاغت کی فصل میں ان معانی پر اسالیب کی دلالت کو سامنے لایا گیا ہے جو موقع و محل کے لحاظ سے متعین ہوتے ہیں۔

تاویل کے عنوان کے تحت کلام کا وہ مفہوم بیان کیا گیا ہے جو موقع و محل کے لحاظ سے متعین ہوتا ہے۔ اس میں زیادہ تر استدلال قرآن مجید اور کلام عرب سے ہے۔

تدبر کے باب میں مبادی اور نتائج کا ذکر ہے۔ یعنی نص کے اقتضا اور اس کے اشارات کو اس میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اس میں استدلال عقل صریح اور کتاب اللہ سے ہے۔

نظم کی فصل میں ہر مجموعہ آیات کے موقع و محل اور اس کے داخلی نظم کو بیان کیا گیا ہے۔

مقدمہ

۱۔ سورہ کی حقیقت اور سورہ فاتحہ و آل عمران سے اس کا ربط:

سورہ بقرہ قرآن مجید کا رخ زیبا ہے جس طرح سورہ فاتحہ اس کا طغرائے پیشانی ہے، اور یہ بھی

کہہ سکتے ہیں کہ یہ سورہ پورے قرآن کا تاج ہے جس طرح سورہ فاتحہ اس کا گوہر آبدار ہے، کیوں کہ یہ سورہ اس آخری بعثت کے خط وخال اور اس کے رموز وحقائق کو پوری طرح اجاگر کرنے اور اس ملت کے قبلہ اور اس کے مسکن کے مرکزی حصہ کو نمایاں کرنے والی ہے۔ نیز یہ دین کی اصل واساس اور شریعت کے مغز اور جوہر کی طرف بھی رہنمائی کر رہی ہے۔ بالفاظ دیگر یہ تکمیل نبوت اور اس کے نقطہ عروج کی سورہ ہے جیسا کہ حضرت ابراہیمؑ نے ان لفظوں میں اپنے رب سے دعا کی تھی:

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

(البقرہ:۱۲۹)

﴿اے ہمارے رب تو ان میں مبعوث فرما انہی میں سے ایک رسول جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔﴾

اللہ تعالیٰ نے ان کی خواہش کو ٹھیک اس دعا کے موافق پورا کر دیا اور ایک ایسا رسول بھیجا جو ان چاروں صفات کا حامل تھا اور اس سورہ کو آپؐ کا اور ایک اطاعت شعار امت کا آئینہ بنایا جس کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی تھی اور آپؐ پر ایمان لانے کو ایمان کی اصل حقیقت قرار دیا کیوں کہ ایمان سے اصل مقصود آپؐ کی نبوت پر ایمان لانا ہے جو کہ سارے ایمان کو شامل ہے اور اسی پر اس کی صحت کا دارومدار ہے۔

معلوم ہوا کہ یہ سورہ اس ایمان کو قوت سے عمل میں لا کر پایہ تکمیل تک پہنچانے اور ثمر آور بنانے کے لیے ہے جو حمد وشکر اور انابت پر مبنی فطری ایمان کی پہلی شاخ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ سورہ سورہ فاتحہ کی تفسیر، کلمہ توحید کی تفصیل، صراط مستقیم کی تشریح اور دعائے ابراہیمؑ کی تکمیل کی سورہ ہے۔ اس کی وضاحت انشاء اللہ نویں فصل میں آئے گی۔

چونکہ سورہ فاتحہ میں قرآن کے جملہ مطالب غایت درجہ ایجاز کے ساتھ اور انتہائی محکم انداز میں سمٹ کر آگئے ہیں اور سورہ پوری کتاب کے لیے بمنزلہ تمہید کے ہے اس لیے اس کے بعد ایسی سورہ رکھی گئی جو ان مطالب کی تفصیل کر دے کیوں کہ اجمال کے بعد تفصیل تعلیم کا سب سے مناسب اور موزوں طریقہ ہے اور قرآن مجید میں تو خاص طور پر اس کی رعایت رکھی گئی ہے، جیسا کہ فرمایا ہے:

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ (سورہ ھود:۱)

﴿یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر خدائے حکیم وخبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی۔﴾

بلکہ تمام آسمانی کتابوں کے نازل فرمانے میں اسی بات کا لحاظ دکھائی دیتا ہے۔ جو کتاب بعد میں نازل ہوئی وہ اپنے ماسبق کی تفصیل بیان کرنے کے لیے نازل ہوئی، یہاں تک کہ قرآن آیا جس نے پچھلی ساری کتابوں کی تفصیل کر دی۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ یہ سورہ کتاب الٰہی کے تمام مطالب کی جامع اور ان کی تفصیل کرنے والی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ درج ذیل امور پر مشتمل ہے:

۱۔ ایمان کی حقیقت اور توحید، نبوت اور معاد سے متعلق بنیادی دلائل۔
۲۔ عقائد کی تفصیلات۔ یعنی اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور یوم آخرت پر ایمان۔ نیز اس کی صفات جیسے علم، قدرت، عدل، حکمت، رحمت اور ربوبیت پر ایمان ویقین۔
۳۔ بنیادی عبادات جیسے نماز، زکوٰۃ، روزہ اور حج۔
۴۔ سیاست کے بنیادی مسائل جیسے خلافت، جہاد، صلح، اطاعت اور جان ومال کی حفاظت۔
۵۔ تمدن کے بنیادی امور جیسے عورتوں اور یتیموں کے حقوق، تجارت اور قرض کا آپس میں لین دین۔
۶۔ معاشرت کے اصول جیسے دوسروں کا پاس ولحاظ، مہربانی، پاکبازی، ناپاک چیزوں مثلاً شراب اور جوئے وغیرہ سے اجتناب۔

اوپر جو امور ہم نے بیان کیے ہیں ان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس سورہ کو سورہ فاتحہ کے بعد شروع کتاب میں کیوں رکھا گیا ہے۔ اور سورہ آل عمران سے پہلے اس کے لائے جانے کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مشابہ ہیں، اگرچہ مطالب میں یکسانیت کے باوجود اول الذکر میں علم کا پہلو نمایاں ہے جب کہ دوسرے میں عمل کے پہلو کو ابھارا گیا ہے، جیسا کہ اس سورہ کی تفسیر کے مطالعہ سے معلوم ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دونوں کی ایک ہی صفت ''زہراوین'' بتائی ہے اور یہ کہ دونوں قیامت کے دن دو بدلیوں کی شکل میں نمودار ہوں گی، یعنی اپنی وسیع برکتوں کے ساتھ اہل ایمان پر سایہ فگن ہوں گی۔ اسی سبب سے آپ نماز میں دونوں سورتوں کو جمع فرماتے تھے اور بعض وقت فجر کی دونوں رکعتوں میں ہر ایک کی ایک ایک آیت تلاوت فرماتے تھے۔ پہلی رکعت میں آیۃ الکرسی اور دوسری میں آیۃ الاسلام۔ چنانچہ یہ سورہ جس طرح تمام سورتوں کے بالمقابل سورہ فاتحہ سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے اسی طرح سورہ آل عمران کو اس سورہ سے زیادہ موافقت ہے اور سورہ بقرہ کو آل عمران پر جو مقدم کیا گیا ہے

تو اس کے متعدد وجوہ ہیں:

۱۔ ایک پہلو یہ ہے کہ یہ سورۃ الایمان ہے اور آل عمران سورۃ الاسلام ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازِ فجر میں ان کی دو آیتوں کی تلاوت فرما کر اس امر کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور اپنے اس عمل سے دونوں کی اصل کی طرف بھی رہنمائی کر دی ہے۔ نیز آپ نے فرمایا ہے:

لكل شئ سنام و لكل سنام ذروة و سنام القرآن سورة البقرة و ذروته آية الكرسی۔

اس طرح آپ نے اس سورہ کے محل و مقام اور ایمان اور توحید کی منزلت کی طرف اشارہ فرما دیا۔

۲۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس سورہ میں زیادہ تر یہود پر حجت قائم کی گئی ہے اور آل عمران میں نصاریٰ پر۔ یہود کے خلاف جو دلائل پیش کیے گئے ہیں وہ نصاریٰ کے لیے بھی مسکت ہیں چنانچہ اس سورہ کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ جبکہ آل عمران کی حیثیت اس کے معاون کی ہے، اور جو چیزیں اس میں اجمالاً بیان ہوئی ہیں ان کی اس میں تفصیل ہے۔

۳۔ تیسرا پہلو یہ ہے کہ یہ سورہ بدر ہے اور آل عمران سورہ احد ہے۔ غزوہ بدر مسلمانوں کے لیے فتح و فرقان تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''**يوم الفرقان يوم التقی الجمعان**'' (انفال:۴۱) ﴿فیصلہ کے دن، جس دن دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوئی﴾ اور غزوہ احد ان کے لیے آزمائش اور تطہیر کا سبب بنی۔

۴۔ چوتھا پہلو یہ ہے کہ غلبہ و فتح کو زیادہ مناسبت حضرت موسیٰ سے ہے اور ابتلاء و آزمائش کو حضرت عیسیٰ سے چنانچہ جو خطاب یہود سے تھا اس کو بدر کے واقعہ سے مناسبت دی اور جو نصاریٰ کے لیے تھا اسے واقعہ احد کے مناسب حال ٹھہرایا۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر اس سورہ کو مقدم رکھا گیا جو اپنے نزول اور درجہ و منزلت کے اعتبار سے اقدم اور زیادہ وسیع الاطراف تھی۔ ان امور میں سے بعض کی تفصیل انشاء اللہ ہم سورہ آل عمران کے مقدمہ میں کریں گے۔

۲۔ سورہ کا موضوع اور اس کا مقصودِ اصلی:

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ اس سورہ نے قرآن مجید کے تمام بنیادی مطالب کو اپنے اندر جمع کر لیا ہے۔ اگر ایک جملہ میں اس کا عمود بتانا ہو تو ہم کہیں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اس عہد کی تکمیل کی سورہ ہے جو اس نے اپنے خلیل حضرت ابراہیمؑ سے باندھا تھا۔ اور یہ عہد ہی دراصل اس دین کی ساری

حقیقت کا جامع ہے۔ کیوں کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اپنی ذریت کو مرکزِ توحید میں آباد کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ یہاں پر ایک نبی اور اس کی امت کو مبعوث فرمائے جو تمام انبیاء اور ان کی امتوں کی صفات و محاسن کے نقطۂ کمال پر ہو، اور اللہ تعالیٰ نے ان سے وعدہ فرما لیا کہ وہ اس پیغمبر اور اس کی امت کے واسطے سے تمام اہل زمین کو برکت دے گا۔ چنانچہ نبی آخر الزمان اور آپ کی امت کو برپا کر کے اللہ تعالیٰ نے ان سے کیے ہوئے وعدے کو پورا کر دیا اور اس امر کی بنیاد صبر اور نماز پر رکھی جو کہ خدائی دین کی اصل و اساس ہیں، انہی کے ذریعہ حضرت ابراہیمؑ کامل بنے اور امام ہوئے۔

جب ان دونوں صفات، صبر اور نماز، کا ظہور کامل صورت میں ہو چکا تب اس سورہ کا نزول ہوا۔ چنانچہ یہ سورہ اس بعثتِ عظمیٰ کی حقیقت کا سب سے بڑا مظہر ہے اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے، جیسا کہ پہلے گزرا، اسے سنام القرآن کہا ہے۔

اس سورہ کے نزول کے وقت اللہ تعالیٰ نے ایک نئی امت برپا کرنے کا اظہار و اعلان فرمایا، اور تحویل قبلہ کو اس کی علامت اور اس امت کے لیے ایک امتیازی نشان قرار دیا۔ چنانچہ اس آخری بعثت پر آپ جس پہلو سے بھی نظر ڈالیں گے توحید کو اس کی اصل، مسجد حرام کو اس کا مرکز اور قرآن کو اس اصل کے بالکل مطابق پائیں گے۔ اسی وجہ سے آپ دیکھتے ہیں کہ سورہ حج قرآن مجید کے وسط میں رکھی گئی ہے اور اس میں ان ابواب کو جمع کر دیا گیا ہے جن کے اندر اس دین کی حقیقت کی جلوہ نمائی ہے۔

اب ہم سورہ حج سے ایک بڑا حصہ یہاں پر پیش کر رہے ہیں تاکہ جو باتیں اس سورہ کے عمود، اس کے مطالب کے اصول و فروع سے متعلق ہم نے بیان کی ہیں اور ان کی حفاظت اور دفاع کے لیے جان و مال کی جو قربانی ہم پر واجب ہے ان کی پوری وضاحت ہو جائے کیوں کہ قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصہ کی بہتر انداز میں تفسیر کر دیتا ہے۔ سورہ حج میں فرمایا ہے:

> ''بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور وہ لوگوں کو اللہ کی راہ اور اس مسجد حرام سے روکتے ہیں جس کو ہم نے لوگوں کے لیے یکساں بنایا، خواہ وہ اس کے شہری ہوں یا آفاقی، (تو انہوں نے بہت بڑے ظلم کا ارتکاب کیا) اور جو اس میں کسی بے دینی، کسی شرک کے ارتکاب کا ارادہ کریں گے تو ہم ان کو ایک عذاب دردناک کا مزا چکھائیں گے۔
>
> اور یاد کرو جب کہ ہم نے ابراہیمؑ کے لیے ٹھکانا بنایا بیت اللہ کی جگہ کو، اس ہدایت کے ساتھ کہ کسی چیز کو میرا شریک نہ ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، قیام کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو، اور لوگوں میں حج کی منادی کر دو وہ تمہارے پاس آئیں گے پیادہ بھی اور نہایت لاغر اونٹنیوں پر بھی جو پہنچیں گی دور دراز گہرے پہاڑی راستوں سے، تاکہ

لوگ اپنی منفعت کی جگہوں پر بھی پہنچیں اور چند خاص دنوں میں، ان چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو بخشے ہیں۔ پس اس میں سے کھاؤ اور فاقہ کش فقیروں کو کھلاؤ۔ پھر وہ اپنے میل کچیل دور کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور بیت قدیم کا طواف کریں۔

ان امور کا اہتمام رکھو اور جو حرمات الٰہی کی تعظیم کرے گا تو اس کے رب کے نزدیک یہ اس کے حق میں بہتر ہے۔ اور تمہارے لیے چوپائے حلال ٹھہرائے گئے ہیں، بجز ان کے جو تمہیں پڑھ کر سنا دیئے گئے ہیں۔ تو بتوں کی گندگی سے اجتناب رکھو اور جھوٹ بات سے بچو۔ اللہ ہی کی طرف یکسو رہو، کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور جو اللہ کا شریک ٹھہراتا ہے اس کی مثال یوں ہے کہ وہ آسمان سے گرے اور چڑیاں اس کو اچک لیں یا ہوا اس کو کسی دور دراز جگہ میں لے جا پھینکے۔ ان امور کا اہتمام رکھو! اور جو اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے تو یاد رکھے کہ یہ چیز دل کے تقویٰ سے تعلق رکھنے والی ہے۔ اور تمہارے لیے ان ہدی کے جانوروں میں ایک خاص وقت تک مختلف قسم کی منفعتیں ہیں پھر ان کو قربانی کے لیے قدیم گھر کی طرف لے جانا ہے۔

ہم نے ہر امت کے لیے قربانی مشروع کی تاکہ اللہ نے ان کو جو چوپائے بخشے ہیں ان پر وہ اس کا نام لیں، پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے تو اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرو، اور خوش خبری دو ان کو جن کے دل خدا کے آگے جھکے ہوئے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کے سامنے خدا کا ذکر آتا ہے ان کے دل دہل جاتے ہیں۔ ان کو جو مصیبت پہنچتی ہے اس پر صبر کرنے والے، نماز کا اہتمام رکھنے والے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے وہ خرچ کرتے ہیں۔

اور قربانی کے اونٹوں کو بھی ہم نے تمہارے لیے شعائر الٰہی میں سے ٹھہرایا ہے۔ تمہارے لیے ان میں بڑے خیر ہیں تو ان پر اللہ کا نام لو ان کو صف بستہ کر کے، پس جب وہ اپنے پہلوؤں پر گر پڑیں تو ان میں سے کھاؤ اور کھلاؤ قانع محتاجوں اور سائلوں کو۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم خدا کے شکر گزار رہو۔ اور اللہ کو نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے نہ ان کا خون بلکہ اس کو صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اسی طرح ہم نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے تاکہ تم اللہ کی ہدایت بخشی پر اس کی تعظیم بجالاؤ اور خوب کاروں کو خوش خبری سنا دو۔

بے شک اللہ مدافعت کرے گا ان لوگوں کی جو ایمان لائے، اللہ ہرگز بدعہدوں اور ناشکروں کو پسند نہیں کرتا۔ جن سے جنگ کی جائے ان کو جنگ کرنے کی اجازت دی گئی بوجہ اس کے کہ ان پر ظلم ہوا اور بے شک اللہ ان کی مدد پر پوری طرح قادر ہے، جو مظلوم اپنے گھروں سے بے قصور محض اس جرم پر نکالے گئے کہ وہ کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے سے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں کثرت سے اللہ کا نام لیا جاتا ہے ڈھائے جا چکے ہوتے اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کے لیے اٹھیں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔ یہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو سرزمین میں اقتدار

بخشیں گے تو وہ نماز کا اہتمام کریں گے، زکوٰۃ ادا کریں گے، معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے اور انجام کار کا معاملہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔

اور اگر یہ لوگ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ ان سے پہلے قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم، قوم لوط اور مدین کے لوگ بھی تکذیب کر چکے ہیں اور موسیٰ کی بھی تکذیب کی گئی۔ تو میں نے ان کافروں کو کچھ ڈھیل دی پھر ان کو دھر لیا۔ تو دیکھو کیسی ہوئی میری پھٹکار، اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ان کے ظلم کی حالت میں ہم نے ہلاک کر دیا تو وہ اپنی چھتوں پر ڈھئی پڑی ہیں اور کتنے ناکارہ کنویں اور کتنے پختہ محل ہیں جو ویران پڑے ہوئے ہیں۔ کیا یہ لوگ ملک میں چلے پھرے نہیں کہ ان کے دل ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سمجھتے یا ان کے کان ایسے ہو جاتے کہ وہ ان سے سنتے کیونکہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں۔

اور یہ لوگ تم سے عذاب کے لیے جلدی مچاتے ہیں حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے اور تمہارے رب کے یہاں کا ایک دن تمہارے شمار کے اعتبار سے ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ان کے ظلم کے باوجود میں نے ڈھیل دی پھر ان کو پکڑ لیا اور میری ہی طرف سب کی واپسی ہے۔

کہہ دو! اے لوگو! میں تو تمہارے لیے بس ایک کھلا ہوا آگاہی پہنچانے والا ہوں تو جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے عمل کیے ان کے لیے مغفرت اور باعزت روزی ہے اور جن کی تگ و دو ہماری آیات کی مخالفت کی راہ میں ہے وہی دوزخ والے ہیں"۔ (الحج: ۴۵ تا ۵۱)

اس کے بعد ان مخالفین کا ذکر ہوا۔ پھر کلام اپنے عمود کی طرف لوٹ کر آ گیا۔ چنانچہ فرمایا:

"اور جن لوگوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت کی پھر وہ قتل کر دیے گئے یا مر گئے تو اللہ ان کو اچھے رزق حسن سے نوازے گا اور بے شک اللہ ہی ہے جو بہترین رزق دینے والا ہے۔ وہ ان کو ایسی جگہ داخل کرے گا جس سے وہ راضی اور مطمئن ہوں گے اور بے شک اللہ علیم و حلیم ہے۔

یہ بات سن لی اور مزید یہ کہ جس نے ویسا ہی بدلہ دیا جیسا کہ اس کے ساتھ کیا گیا پھر اس پر تعدی کی گئی تو اللہ اس کی ضرور مدد فرمائے گا۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔

یہ اس وجہ سے ہوگا کہ اللہ ہی ہے جو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اللہ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔ یہ اس وجہ سے بھی ہوگا کہ اللہ ہی معبود حقیقی ہے اور جن چیزوں کو یہ اللہ کے سوا پکارتے ہیں سب باطل ہیں اور بے شک اللہ ہی ہے جو برتر اور عظیم ہے"۔ (الحج: ۵۸ تا ۶۲)

آگے اللہ تعالیٰ کی بعض صفات بیان ہوئیں پھر کلام کا رخ اصل بات کی طرف مڑ گیا اور فرمایا:

"اور ہم نے ہر امت کے واسطے ایک طریقہ ٹھہرا دیا ہے تو وہ اسی پر چلیں گے تو وہ اس معاملہ میں تم

سے نزاع کی راہ نہ پائیں اور اپنے رب کی طرف بلاتے رہو۔ بے شک تم ہی سیدھی راہ پر ہو اور اگر وہ تم سے جھگڑا کریں تو کہہ دو کہ اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔ اللہ فیصلہ کرے گا تمہارے درمیان قیامت کے دن اس چیز کا جس میں تم اختلاف کر رہے ہو"۔ (الحج: ۶۷ تا ۶۹)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ذکر ہوا جو موقع و محل کے مناسب تھیں جیسے اپنے حکم اور فیصلہ میں اس کا یکتا ہونا اور پیغمبروں کو منتخب فرمانا۔ یہاں تک کہ کلام اپنے محور کی طرف لوٹ کر آ گیا۔ چنانچہ فرمایا:

"اے ایمان والو! رکوع اور سجدہ اور اپنے رب کی بندگی کرتے رہو اور بھلائی کے کام کرو تا کہ فلاح پاؤ اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کرو جیسا کہ اس کا حق ہے۔ اسی نے تم کو برگزیدہ کیا اور دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ تمہارے باپ ابراہیم کی ملت کو تمہارے لیے پسند فرمایا۔ اسی نے تمہارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے اور اس قرآن میں بھی تمہارا نام مسلم ہے تا کہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دے اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ کو مضبوط پکڑو۔ وہی تمہارا مرجع ہے اور کیا ہی خوب مرجع اور کیا ہی خوب مددگار ہے"۔ (الحج: ۷۷۔۷۸)

اس پورے ٹکڑے کو بعینہٖ ہم نے صرف اس لیے نقل کیا ہے کہ ہمارے پیغمبر کی بعثت کی حقیقت، ملت ابراہیم کی اصلیت اور وہ تمام باتیں کھل کر سامنے آ جائیں جو سورہ بقرہ کے اندر موجود ہیں، مثلاً:

۱۔ بناء کعبہ کا ذکر۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعا کہ اللہ تعالیٰ مکہ کو پر امن سرزمین بنا دے، اس کے باشندوں کو رزق عطا کرے، انہیں عبادت کے طریقے سکھائے اور ان میں ایک ایسا پیغمبر مبعوث فرمائے جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سنائے، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔

۳۔ ہمارے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صورت میں اس دعا کی قبولیت کا ذکر۔

۴۔ ان لوگوں کے خلاف جہاد کا حکم جنہوں نے پیغمبر کو گھر سے نکال دیا اور انہیں ان کے کیے کی ویسی ہی سزا دینے، فتنہ کی آگ بجھانے، جان و مال اور آزادی کی حفاظت کے لیے حکومت کے قیام اور سب کے اسلام میں داخل ہو جانے کو ضروری قرار دینے کا ذکر۔

۵۔ اس امر کا بیان کہ ان کا دین ایسا ہے جس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ یہی ان کے دین کی اصل اور یہی اللہ کا رنگ ہے۔

۶۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنی جماعت کی نصرت و حمایت اور ذکر و عبادت کے مقامات کی حفاظت کے لیے بعض کو بعض کے ذریعہ دفع کرنے کا ذکر۔

۷۔ اس بات کا ذکر کہ نماز، زکوٰۃ، اعتصام باللہ اور اس کے گھر کا حج اصل مقصود دین ہے اور تمام خیر و برکت کے چشمے انہیں سے پھوٹتے ہیں۔

۸۔ اس امر کا بیان کہ دین پر قائم رہنا، اس کے لیے گواہی دینا، اس کی نگرانی کرتے رہنا اور اس کے لیے جان و مال کی قربانی دینا واجب ہے۔

۳۔ اس غایت و مقصد سے واقعات کی مطابقت:

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد دیکھیے کہ اس عظیم الشان معاملہ میں تدبیر الٰہی کس طرح کارفرما ہوئی۔ جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو نبوت سے سرفراز کیا تو آپ کو نماز، توحید، صدقہ اور صبر کا حکم دیا جیسا کہ فرمایا ہے:

يَا اَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ. وَ رَبَّكَ فَكَبِّرْ وَ ثِيَابَكَ فَطَهِّرْ. وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ. وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ. (سورہ المدثر: ۱۔۷)

﴿اے چادر لپیٹے رکھنے والے! اٹھو اور لوگوں کو ڈراؤ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کرو اور اپنے دامن کو پاک رکھو اور ناپاک چیز سے دور رہو اور احسان نہ دھرو زیادہ سمجھ کر اور اپنے رب کی راہ میں ثابت قدم رہو۔﴾

اسی طرح نماز، زکوٰۃ اور صبر کو توحید کے بعد اولین حکم قرار دیا۔ یہی بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت میں بھی نظر آتی ہے جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں فرمایا ہے:

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوحٰى اِنَّنِيْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ. (طٰہٰ: ۱۳۔۱۴)

﴿اور میں نے تم کو چن لیا ہے تو جو وحی کی جا رہی ہے اسے دھیان سے سنو۔ بے شک میں ہی اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں اس لیے میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز کا اہتمام کرو۔﴾

اسی کے مثل سورہ یونس میں ہے:

وَ اَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى وَ اَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ. (یونس: ۸۷)

﴿اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کی طرف وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں کچھ گھر ٹھہرا لو اور اپنے گھروں کو قبلہ بناؤ اور نماز کا اہتمام کرو اور ایمان لانے

والوں کو خوشخبری دو۔﴾

چنانچہ رسول اللہ ﷺ اپنی قوم کی ایذا رسانیوں اور نماز میں ان کے رکاوٹ ڈالنے کے باوجود پورے صبر اور عزم کے ساتھ ان حکموں پر عمل پیرا رہے جیسا کہ سورہ اقرأ میں مذکور ہے:

اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى عَبْدًا اِذَا صَلّٰى اَرَاَيْتَ اِنْ كَانَ عَلَى الْهُدٰۤى اَوْ اَمَرَ بِالتَّقْوٰى. اَرَاَيْتَ اِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى. اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى. كَلَّا لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ. (اقرأ:۹۔۱۶)

﴿دیکھا تو نے اسے جو روکتا ہے ایک بندے کو جب وہ نماز پڑھتا ہے۔ کیا دیکھا اگر وہ ہدایت پر ہوا یا پرہیزگاری کی بات اس نے بتائی۔ اور کیا تو نے دیکھا جب اس نے جھٹلایا اور منہ پھیر لیا۔ کیا اس نے نہیں جانا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ ہرگز نہیں اگر وہ باز نہ آیا تو ہم چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے، جھوٹی نابکار گنہگار چوٹی۔﴾

آپ لوگوں کو انذار کرتے، انہیں نرمی کے ساتھ اور صاف کھلے لفظوں میں ملت ابراہیم کی طرف بلاتے اور اس بات کی یاددہانی کراتے کہ اللہ تعالیٰ نے اصحاب فیل سے بیت حرام کی حفاظت کی اور اس کو تمہاری وابستگی، رزق اور امن و سکون کا ذریعہ بنایا۔ اس لیے تم پر لازم ہے کہ اس گھر کے رب کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ لیکن لوگوں نے آپ کی بات نہیں مانی، آپ کی دعوت پر کان نہیں دھرا اور اللہ تعالیٰ کی نعمت کا انکار کر دیا یہاں تک کہ اپنے پیغمبر کو اس کے گھر سے نکال دیا۔

جب آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تو آپ کا سب سے بڑا مقصد کعبہ کی حصولیابی، بیت حرام کو بتوں سے پاک کرنا اور ملت حنیفی کو اس کے اصل کی طرف لوٹانا تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قتال کا حکم دیا جیسا کہ سورہ بقرہ میں ہے:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ" لَّكُمْ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّ هُوَ خَيْرٌ" لَّكُمْ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ. يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ قُلْ قِتَالٌ" فِيْهِ كَبِيْرٌ" وَ صَدٌّ" عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌ" بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ وَالْفِتْنَةُ (ای اکراہ الناس علی ترک دینهم) اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ. (البقرہ:۲۱۶۔۲۱۷)

﴿تم پر قتال فرض کیا گیا اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ممکن ہے تم کو ایک شے ناگوار معلوم

ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہو سکتا ہے تم ایک شے کو پسندیدہ سمجھو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ وہ تم سے شہر حرام میں جنگ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو اس میں جنگ بڑی سنگین بات ہے۔ لیکن اللہ کے راستہ سے روکنا اس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روک دینا اور اہل مسجد کو اس سے نکالنا اس سے بھی زیادہ سنگین معاملہ ہے۔ اور فتنہ (یعنی لوگوں کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کرنا) قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔﴾

اللہ تعالیٰ نے ان امور کا ذکر اس لیے کیا کہ آپؐ کی قوم کے لوگوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ خدا کا انکار، اس کی سجدہ گاہ کے راستہ میں رکاوٹ ڈالنا، اہل ایمان کو وہاں سے نکالنا، ان کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کرنا اور اس معاملہ میں آزادی کو سلب کر لینا خدا کے نزدیک بہت بڑی بات ہے۔

پھر آپ ﷺ کے پیش نظر کعبہ کی حصولیابی کا جو سب سے بڑا مقصد تھا وہ اس سے بھی بڑھ کر ایک اور خاص وجہ سے تھا۔ دوسری فصل کے آخر میں ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں اور اب اس کو واضح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ مقصد خاص ہر چیز پر اولیت رکھتا تھا اور آپ کی بعثت کی اصل غرض و غایت تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں اس وقت تک صبر سے کام لینے کا حکم دیا جب تک حجت پوری نہ ہو جائے۔ اور موعظت و نصیحت اور دعوت کا کام پایہ تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔

(جاری ہے)

حواشی

۱۔ دیکھیے صحیح مسلم۔ باب فضل قرأۃ القرآن وسورۃ البقرہ۔ نیز دیکھیے تفسیر ابن کثیر ۱:۳۲۔۳۳

۲۔ مولانا نے اس کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ "مجھے حدیث کے الفاظ یاد نہیں رہے بعد میں اس کی تصحیح کر دی جائے گی"۔ یہ حدیث ترمذی میں ان لفظوں میں بیان ہوئی ہے "ولکل شیء سنام و ان سنام القرآن سورۃ البقرۃ و فیها آیة هی سیدة ای القرآن: آیة الکرسی "اس کے ایک راوی حکیم بن جبیر کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، لیکن مسند امام احمد نے معقل بن یسار سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "البقرۃ سنام القرآن و ذروته و یس قلب القرآن ......" نیز دیکھیے تفسیر ابن کثیر ۱:۳۱

امین احسن اصلاحی

درس صحیح بخاری

(کتاب الکفالہ کی روایات)

باب ۷: جوارُ ابی بکرؓ فِی عَهْدِالنَّبِیِّ ﷺ وَ عَقْدِهٖ

باب: نبی ﷺ کے عہد میں حضرت ابوبکرؓ کی پناہ گیری اور اس کا عہد

۸. حدثنا یحیی بن بکیر حدثنا اللیث عن عقیل قال ابن شهاب فاخبرنی عروۃ بن الزبیر ان عائشۃ زوج النبی ﷺ قالت لم اعقل ابوی الا وهما یدینان الدین وقال ابو صالح حدثنی عبداللّٰه عن یونس عن الزهری قال اخبرنی عروۃ بن الزبیر ان عائشۃ قالت لم اعقل ابوی قط الا وهما یدینان الدین و لم یمر علینا یوم" الا یاتینا فیه رسول اللّٰه ﷺ طرفی النهار بکرۃ و عشیۃ فلما ابتلی المسلمون خرج ابوبکرؓ مهاجرا قبل الحبشۃ حتی اذا بلغ برک الغماد لقیه ابن الدغنۃ وهو سید القارۃ فقال این تریدیا ابابکر فقال ابوبکر اخرجنی قومی فانا ارید ان اسیح فی الارض فاعبد ربی قال ابن الدغنۃ ان مثلک لا یخرج ولا یخرج فانک تکسب المعدوم و تصل الرحم و تحمل الکل و تقری الضیف و تعین علی نوائب الحق و انا لک جار" فارجع فاعبد ربک ببلادک فارتحل ابن الدغنۃ فرجع مع ابی بکر فطاف فی اشراف کفار قریش فقال لهم ان ابابکر لا یخرج مثله و لا یخرج اتخرجون رجلا یکسب المعدوم و یصل الرحم و یحمل الکل و یقری الضیف و یعین علی نوائب الحق فانفذت قریش" جوار ابن الدغنۃ و امنوا ابابکرؓ وقالوا لابن الدغنۃ مر ابا بکر فلیعبد ربه فی داره فلیصل ولیقرأ ماشاء ولا یوذینا بذالک ولا یستعلن به فانا قد خشینا ان یفتن ابناء نا و نساء نا قال ذالک ابن الدغنۃ لابی بکرؓ فطفق ابوبکر یعبد ربه فی داره ولا یستعلن بالصلوۃ ولا القراءۃ فی غیر داره ثم بدا لابی بکر فابتنی مسجدا بفناء داره وبرز فکان یصلی فیه و یقرأ القرآن فیتقصف علیه نساء

المشرکین و ابناء هم یعجبون و ینظر الیه و کان ابوبکر رجلا بکاء لا یملک دمعه حین یقرء القرآن فافزع ذالک اشراف قریش من المشرکین فارسلوا الی ابن الدغنۃ فقدم علیهم فقالوا لهم انا کنا اجرنا ابابکرؓ علی ان یعبد ربه فی داره و اعلن الصلوۃ و القراءۃ وقد خشینا ان یفتن ابناء نا و نساء نا فاته فان احب ان یقتصر علی ان یعبد ربه فی داره فعل و ان ابی الا ان یعلن ذالک فسله ان یرد الیک ذمتک فانا کرهنا ان نخفرک و لسنا مقرین لابی بکر الا ستعلان قالت عائشۃ فاتی ابن الدغنۃ ابابکرؓ فقال قد علمت الذی عقدت لک علیه فاما ان تقتصر علی ذالک و اما ان ترد الی ذمتی فانی لا احب ان تسمع العرب انی اخفرت فی اجل عقدت له قال ابوبکرؓ انی اردالیک جوارک و ارضی بجوار اللّٰه و رسول اللّٰه ﷺ یومئذ بمکۃ فقال رسول اللّٰه ﷺ قد اریت دار هجرتکم رایت سبخۃ ذات نخل بین لا بتین وهما الحرتان فهاجر من هاجر قبل المدینۃ حین ذکر ذالک رسول اللّٰه ﷺ ورجع الی المدینۃ بعض من کان هاجر الی ارض الحبشۃ و تجهز ابوبکر مهاجرا فقال له رسول اللّٰه ﷺ علی رسلک فانی ارجوا ان یوذن لی قال ابوبکرؓ هل ترجوا ذالک بابی انت قال نعم فحبس ابوبکرؓ نفسه علی رسول اللّٰه ﷺ لیصحبه و علف راحلتین کانتا عنده ورق السمر اربعۃ اشهر.

ترجمہ: حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے، وہ فرماتی ہیں کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنے ماں باپ کو اسی دین (دین اسلام) پر پایا ہے۔ اور ہم پر کوئی دن نہیں گزرتا تھا مگر نبی ﷺ صبح وشام دونوں وقت ہمارے ہاں آتے تھے۔ جب مسلمانوں کا ابتلاء بہت شدید ہو گیا تو ابوبکرؓ صدیق ہجرت کر کے حبشہ کی طرف نکلے۔ یہاں تک کہ جب برک الغماد پہنچے تو ابن دغنہ ملا جو قارہ قبیلہ کا سردار تھا۔ اس نے پوچھا، ابوبکرؓ کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا میری قوم نے مجھے نکال چھوڑا ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اللہ کی زمین میں چل پھر کر اس کی عبادت کرتا رہوں۔ ابن دغنہ نے کہا تمہارے جیسا شخص نکلے گا اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ تم غریبوں کی اعانت کرتے ہو، صلہ رحمی کرتے ہو، لوگوں کا بار اٹھاتے ہو، لوگوں کی میزبانی کرتے ہو اور لوگوں کے مسائل اور مشکلات میں ان کی مدد کرتے ہو تو کس طرح تمہارے جیسا شخص نکال دیا گیا، آؤ میں تمہیں پناہ دیتا ہوں، واپس چلو اور اپنے شہر میں اپنے رب کی عبادت کرو۔ ابن دغنہ لوٹا اور حضرت ابوبکرؓ اس کے ساتھ لوٹ آئے۔ ابن الدغنہ گھوم پھر کر سب کفار قریش سے ملا اور ان سے کہنے

لگا، دیکھو ابو بکرؓ کا سا آدمی نکل سکتا اور نہ نکالا جا سکتا ہے۔ کیا تم ایسے شخص کو نکالو گے جو غریبوں کی اعانت کرتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، لوگوں کا بار اٹھاتا ہے، میزبانی کرتا ہے اور لوگوں کی مشکلات میں ان کا سہارا بنتا ہے تو قریش نے ابن دغنہ کی پناہ کو مان لیا اور ابو بکرؓ کو امان دے دی۔ ابن دغنہ سے کہا کہ ابو بکرؓ سے کہہ دے کہ اپنے گھر میں اللہ کی عبادت کریں، نماز پڑھیں اور جو چاہے قرأت کریں مگر ہمیں دکھ نہ دیں اور اس کا اعلان نہ کریں کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ وہ ہمارے بچوں کو اور عورتوں کو بہکا دیں گے۔ ابن دغنہ نے ابو بکرؓ کو یہ بات کہہ دی اور ابو بکرؓ اپنے گھر میں عبادت کرنے لگے اور علانیہ یا اپنے گھر کے سوا کسی اور جگہ نماز اور قرآن پڑھنا چھوڑ دیا۔ پھر ابو بکرؓ کے دل میں آیا تو انہوں نے اپنے گھر کے سامنے صحن میں ایک مسجد بنالی اور باہر نکل کر وہاں نماز شروع کر دی۔ جب وہ وہاں قرآن پڑھتے تو مشرکین کی عورتیں اور بچے جمع ہو جاتے اور تعجب کرتے اور غور سے ان کو دیکھتے اور ابو بکرؓ بہت گریہ والے آدمی تھے۔ وہ جب قرآن پڑھتے تو اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس چیز نے مشرکین قریش کو گھبرا دیا تو انہوں نے ابن دغنہ کو پیغام بھیجا۔ وہ آیا تو انہوں نے کہا ہم نے ابو بکرؓ کو اس شرط پر امان دی تھی کہ وہ اپنے گھر میں عبادت کریں لیکن انہوں نے اس سے آگے قدم بڑھا لیا ہے اور اپنے مکان کے صحن میں ایک مسجد بنالی ہے اور نماز علی الاعلان پڑھتے ہیں اور قرأت بلند آواز سے کرتے ہیں۔ ہمیں یہ ڈر ہے کہ وہ ہمارے بچوں کو اور ہماری عورتوں کو فتنہ میں مبتلا کر دیں گے۔ تم اس کے پاس جاؤ۔ اگر وہ اس پر قناعت کرتے ہیں کہ وہ اپنے گھر میں عبادت کریں گے تب تو کریں اور اگر وہ اس پر راضی نہیں ہیں اور اعلان کرنا ضروری سمجھتے ہیں تب ان سے کہو کہ جو امان تم نے انہیں دی ہے وہ واپس کر دیں کیونکہ ہم کو تمہاری امان توڑنا اچھا نہیں معلوم ہوتا اور ابو بکرؓ کے یہ سب کچھ علانیہ کرنے پر ہم راضی نہیں۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ابن دغنہ ابو بکرؓ کے پاس آیا اور کہا کہ جس پر میرا اور آپ کا عہد ہوا تھا وہ آپ کو معلوم ہے، تو یا تو آپ اسی شرط پر قائم رہیے یا میرا ذمہ مجھے واپس کر دیجئے، اس لیے کہ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اہل عرب یہ کہیں کہ میں نے ایک آدمی کو پناہ دی، پھر اپنی امان کو توڑ دیا۔ ابو بکرؓ نے کہا کہ میں آپ کی پناہ آپ کو واپس کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی پناہ پر راضی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت تک مکہ ہی میں تھے۔ آپ نے فرمایا مجھے خواب میں تم لوگوں کا دارالہجرت دکھایا گیا ہے۔ میں نے دو پتھریلے رقبوں کے درمیان کھجور کے درختوں والی کلرزمین دیکھی ہے۔ جب مسلمانوں نے رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سنی تو جس نے ہجرت کرنی تھی مدینہ کی طرف کی اور کچھ لوگ جو حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے وہ بھی مدینہ کو لوٹ آئے۔ ابو بکر صدیقؓ نے بھی ہجرت کی تیاری شروع کر دی تو نبی ﷺ نے فرمایا ابھی ذرا توقف کرو کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے بھی ہجرت کی

اجازت مل جائے گی۔ ابو بکرؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان، کیا آپ ایسی توقع رکھتے ہیں؟ آپ نے فرمایا ہاں، تو ابو بکرؓ نے اپنے آپ کو روک رکھا کہ آنحضرت ﷺ کی ہمراہی میں ہجرت کریں گے۔ انہوں نے دو اونٹنیاں اس سفر کے لیے خاص طور پر پالیں اور ان کو کیکر کے پتے چار مہینے تک کھلاتے رہے۔

وضاحت: یہ روایت عرب کی تاریخ، عرب کی روایات، عرب کے خیر و شر اور ہجرت کے ابتدائی دور کے واقعات کے بارے میں بہت اہم روایت ہے۔ اس میں عرب کے معروف و منکر کا اس خوبی کے ساتھ تذکرہ ہوا ہے کہ اس خوبی کے ساتھ کہیں اور ملنا ذرا مشکل ہوگا اور اس معروف و منکر کے جاننے کی بڑی ضرورت پڑتی ہے۔

یہ روایت حضرت عائشہؓ سے ہے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت کا ایک خاص پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ بہت اعلیٰ زبان استعمال فرماتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑے بلیغ آدمی کا بھی ان کے برابر بلیغ ہونا آسان نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ پوری روایت اگر ان ہی کی ہوتی، کسی دوسرے کا دخل نہ ہوتا، تب تو یہ ادب کے اعتبار سے بھی ایک شاہکار روایت ہوتی۔ اب یہی فقرہ لیجئے '**لم اعقل ابوی قط الا وھما یدینان الدین**' میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے والدین کو اسی دین پر پایا ہے۔ یہ زبان فصیح و بلیغ عربی کی ہے۔ اس میں یہ مطلب بھی مخفی ہے کہ اگر ان کا کوئی اور دین رہا ہوگا تو میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے رہا ہوگا۔ اس کی عربی ہم بناتے تو شاید چھ سطروں میں یہ مفہوم ادا کرتے۔ **و لم یمر علینا یوم الا یاتینا فیه رسول الله** ﷺ **طرفی النھار بکرۃ و عشیة**۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم پر کوئی دن نہیں گزرتا تھا مگر نبی ﷺ صبح و شام دونوں وقت ہمارے ہاں آتے تھے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ کسی دن ناغہ نہ ہوتا رہا ہو۔ مطلب یہ ہے کہ بیشتر و اکثر آپ تشریف لاتے تھے۔ ہجرت کے قرب کے واقعات میں جب کہ مسلمانوں کا ابتلاء بہت بڑھ گیا تو نبی ﷺ کے تمام مشوروں کا انحصار چونکہ سیدنا ابو بکرؓ پر تھا اور وہ حضور کے بعد اسلام کے ایک ستون تھے، اس لیے اکثر آپ حضرت ابو بکرؓ کے پاس جاتے تھے۔ لہٰذا حضرت عائشہؓ کا یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ادائے مطلب کا ایک طریقہ ہے۔

اس روایت میں بعض الفاظ شاندار ترکیب میں استعمال ہوئے ہیں۔ اوپر حضرت عائشہؓ کی زبان کے حوالے دیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ابن دغنہ کے بارے میں آیا ہے کہ **فطاف فی اشراف کفار** تو یہاں طاف کا لفظ نادر استعمال ہوا ہے۔ یعنی گھوم پھر کر، چکر لگا کر۔ اسی طرح آنحضرت ﷺ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا، **علی رسلک**، ذرا توقف کرو، یہ بھی زبان کا عمدہ اسلوب ہے۔ البتہ **فارتحل ابن دغنه فرجع مع ابی بکر**ؓ میں لفظ فارتحل کھٹکتا ہے۔

ابن دغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو پناہ دینے کی حمایت میں سرداران قریش سے جو باتیں کیں وہ یہ ہیں کہ کیا تم ایسے شخص کو نکالو گے جو غریبوں کی اعانت کرتا ہے، صلہ رحمی کرتا ہے، لوگوں کا بار اٹھاتا ہے، میزبانی کرتا ہے اور لوگوں کی مشکلات میں ان کا سہارا بنتا ہے تو مشرکین قریش نے ابن دغنہ کی بات مان لی اور اس کو اجازت دے دی کہ وہ ابوبکرؓ کو پناہ دے دے۔ اس سے ایک تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابن دغنہ ایک با اثر لیڈر تھا۔ دوسرے جو باتیں اس نے کی ہیں وہ عرب کے اخلاقی معیار کی عکاسی کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں اس دور کا نہایت ہی گھٹیا تصور دیا جاتا ہے کہ گھوڑا آگے بڑھانے پر، پانی کے پینے پلانے پر اور ہر معمولی بات پر اکثر ان میں جھگڑا رہتا تھا۔ حالی نے عربوں کے کردار کا بہت عامیانہ تصور دیا ہے۔ مولوی شبلی مرحوم نے بھی ان کو ان ہی کانٹوں میں گھسیٹا ہے، حالانکہ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی مہذب قوم کا آدمی بھی ایسی عمدہ تقریر نہیں کر سکتا۔ آپ اخلاقیات کے سارے دفتر میں ڈھونڈ لیجئے، یہ بنیادی صفات کسی میں ہوں تو وہ بہترین انسان ہے اور جو بہترین انسان ہے وہی بہترین مسلمان ہے، اور وہی اللہ تعالیٰ کا اصلی بندہ ہے۔ حالی کا ذکر میں نے اس لیے کیا کہ ان سے بڑی امیدیں تھیں مگر حقیقت یہ ہے کہ علم سے یہ لوگ محروم تھے، اس لیے کہ قرآن جیسا پڑھنا چاہیے تھا انہوں نے نہیں پڑھا تھا۔ اگر حدیثیں ہی پڑھی ہوتیں تو معلوم ہوتا کہ ابن دغنہ جیسے شخص کو علم تھا کہ انسانیت کی اصل اساسات کیا ہیں۔ اگر آپ کو عرب کے خیر و شر پر لکھنا ہو تو اس روایت کے سوا اور بھی ذخیرہ ہے مگر سب سے بڑی بنیاد یہ روایت بنے گی۔

ابن دغنہ نے حضرت ابوبکرؓ کو پناہ اس شرط پر دی کہ وہ اللہ کی عبادت، نماز اور قرآن کا پڑھنا علانیہ نہیں کریں گے بلکہ اپنے گھر کے اندر کریں گے۔ پھر یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد حضرت ابوبکرؓ کی رائے بدل گئی اور انہوں نے علانیہ گھر کے باہر کھلی جگہ میں نماز اور قرآن بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس معاملہ میں دین کی تعلیم یہ ہے کہ اگر دین اور خاندان کی مصلحت ہو تو آدمی خاموشی سے یہ کام کر سکتا ہے لیکن اگر محسوس کرتا ہے کہ عزیمت کا تقاضا اس کے برعکس ہے تو وہ اس کو بھی اختیار کر سکتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے محسوس کیا کہ قریش سے نرم گرم کچھ معاملہ کر لینا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ ابن دغنہ کے اثر و رسوخ اور اس کی دی ہوئی امان کے اعتماد پر انہوں نے یہ فیصلہ کیا ہو۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے اور اسی کا زیادہ احتمال ہے کہ اس وقت تک چونکہ مکہ میں مسلمان بہت بڑی تعداد میں اور سخت مصیبت میں تھے، ان کے لیے سب سے بڑا سہارا آنحضرت ﷺ کا اور ان کے بعد حضرت ابوبکرؓ کا تھا۔ خود آنحضرت ﷺ کو اللہ کے سوا کسی کی حمایت کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کے باوجود آپ مشورہ کے لیے اکثر حضرت ابوبکرؓ کے پاس جاتے تھے۔ اس لیے حضرت ابوبکرؓ نے بالکل گوشہ نشین ہو جانا مناسب نہیں سمجھا۔ چنانچہ انہوں

نے پہلے تو رخصت کی راہ اختیار کی جس کی دین میں بہر حال گنجائش ہے، لیکن بعد میں انہوں نے دین کے مفاد کو دیکھ کر دوسرا پہلو اختیار کیا۔ یعنی پہلے رخصت کا پہلو انہوں نے اختیار کیے رکھا اور گھر کے اندر نماز پڑھتے رہے، پھر غریب مسلمانوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے اور دوسرے مصالح کے پیش نظر انہوں نے عزیمت کی راہ اختیار کی اور حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کی علی الاعلان عبادت کو دیکھ کر مشرکین قریش گھبرا گئے اور انہوں نے ابن دغنہ سے کہا کہ وہ ابوبکرؓ سے کہہ دے کہ وہ اپنے گھر کے اندر عبادت کریں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو ابن دغنہ نے ان کی امان کی جو ذمہ داری لی ہے وہ اس کو واپس کر دیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں میں اس طریقہ کے جو عہد و پیمان ہوتے تھے ان کی کتنی اہمیت تھی۔ ابن دغنہ نے حضرت ابوبکرؓ سے یہ بات کہہ دی اس لیے کہ اس کو اپنے عہد کا پاس تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا عہد توڑا جائے اور اس کی حیثیت عرفی کو نقصان پہنچے اور لوگ یہ کہیں کہ اس کے قول و قرار کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ کردار کے لحاظ سے ایک بہترین قوم کے فرد کا جو کردار ہونا چاہیے اس کا اس نے مظاہرہ کیا۔ ایک ہم ہیں کہ ہمارے قول و قرار بالکل بے وزن ہیں۔

جب حضرت ابوبکرؓ نے ابن دغنہ کی ذمہ داری اس کو لوٹا دی، اس وقت تک آنحضرت ﷺ مکہ میں تھے یعنی آپ نے ہجرت نہیں کی تھی۔ آپ نے مسلمانوں کو بتایا کہ مجھے خواب میں تمہارا دارالہجرت دکھایا گیا ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ کالے پتھروں والے رقبوں کے درمیان کلر زمین پر کھجور کے درخت ہیں۔ یہ اشارہ مدینہ کی طرف تھا۔ اس سے پہلے لوگ حبشہ کی طرف ہجرت کرتے تھے کیونکہ حبشہ کا بادشاہ عیسائیوں کے اس فرقہ سے تعلق رکھتا تھا جو حضرت عیسیٰؑ کے خلیفہ راشد کا پیروکار تھا۔ یہی وہ نصاریٰ ہیں جن کی قرآن میں تعریف کی گئی ہے۔ دوسرے عیسائی پال کے پیرو ہیں۔ نبی ﷺ سے اشارہ پا کر لوگوں نے حبشہ کی بجائے مدینہ کی طرف ہجرت شروع کر دی اور حضرت ابوبکرؓ بھی ہجرت کی تیاری کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ذرا توقف کرو کیونکہ توقع ہے کہ مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔ دوسرے لوگ تو ہجرت کر سکتے تھے لیکن پیغمبر چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ڈیوٹی پر مامور ہوتا ہے اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر ہجرت نہیں کر سکتا۔ اگر کرے تو اس کو وہ امتحان پیش آ سکتا ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کو پیش آیا۔ آنحضرت ﷺ انتظار میں رہے یہاں تک کہ آپ کو اجازت مل گئی۔ اس دوران میں حضرت ابوبکرؓ نے ہجرت کے سفر کے لیے دو اونٹنیاں خاص طور پر تیار کیں اور ان کو چار مہینے تک کیکر کے پتے کھلاتے رہے، گویا خواب دیکھنے کے بعد ہجرت کی اجازت ملنے میں چار مہینے لگے۔

روایت ہے بڑی اہم لیکن امام صاحب کا عجیب حال ہے کہ روایت اس جگہ لاتے ہیں جہاں اس کا مظنہ نہیں ہوتا۔

باب ۸: اَلدَّین

باب: قرض کے بارے میں

۹. حدثنا یحیی بن بُکیرٍ حدثنا اللیثُ عن عقیلٍ عن ابن شہابٍ عن ابی سَلَمَۃَ عن ابی ھُرَیرۃؓ ان رسول اللّٰہ ﷺ کان یُوتیٰ بالرَّجلِ المُتوفّٰی علیہ الدین فیسأل ھل ترکَ لدینہ فضلًا فان حُدثَ انہٗ ترکَ لدینہ وَ فاءً صلّی و الا قالَ لِلمُسلمینَ صَلُّوا علٰی صاحبکم فلمّا فَتحَ اللّٰہُ عَلیہ الفُتُوحَ قال انا اولٰی بالمومنین فترکَ دَینًا فعلیَّ قضاؤہٗ و من ترکَ مَالًا فلورثتہٖ.

ترجمہ: ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے پاس کوئی میت لائی جاتی جس پر قرض ہوتا تو آپ پوچھتے کہ کیا اس نے اپنے قرض کی ادائگی کے لیے کچھ مال چھوڑا ہے۔ اگر بیان کیا جاتا کہ اس نے قرض کی ادائگی کے لیے اتنا چھوڑا ہے جس سے کہ اس کا پورا قرض ادا ہو سکتا ہے تو آپ نماز جنازہ پڑھ دیتے، ورنہ مسلمانوں سے کہہ دیتے کہ تم اپنے بھائی کی نماز پڑھو۔ پھر جب اللہ نے آپ کے اوپر فتوحات کے دروازے کھول دیے تو آپ نے فرمایا کہ میں اہل ایمان کے لیے سب سے زیادہ خیر خواہ ہوں تو مومنین میں سے جو شخص وفات پائے گا اور قرض چھوڑے گا تو اس کی ادائگی میرے ذمہ ہے اور جو مال چھوڑے گا تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔

وضاحت: انہ ترک لدینہ وفاء میں وفاء کا لفظ بہت اچھا استعمال ہوا ہے۔ مطلب یہ کہ اتنا چھوڑا ہے کہ پورا قرض ادا ہو سکتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ پیغمبر ہی کا یہ مقام ہے کہ وہ اہل ایمان کا سب سے بڑھ کر خیر خواہ ہوتا ہے۔

یہ روایت الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ پہلے بھی گزر چکی ہے۔ میرے نزدیک یہ روایت اس مضمون کی جتنی روایتیں ہیں ان سب سے زیادہ جامع ہے اور الفاظ بھی نپے تلے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب الوکالہ

باب ۱: وَکالَۃُ الشَّریکِ الشریکَ فی القسمۃِ وغیرِھَا

وقد اشرکَ النبیُّ ﷺ علیًّا فی ھدیہٖ ثُمّ امرَہٗ بقسمتِھا.

باب: تقسیم میں اور دوسرے کاموں میں ایک شریک کا معاملہ کو دوسرے شریک کے ذمہ لگا دینا۔ نبی ﷺ نے حضرت علی کو اپنی ہدی میں شریک کیا، پھر ان کو اس کی تقسیم کا بھی حکم دیا۔

وضاحت: وکالت کا وہی مفہوم ہے جس مفہوم میں ہم اس کو سمجھتے ہیں۔ آدمی ہر کام اصالتاً یعنی خود موجود ہو کر نہیں کر سکتا۔ مجبوریاں پیش آتی ہیں تو اکثر کام وکالتاً کرنا پڑتا ہے۔ یعنی اس کا کوئی نمائندہ اس کی طرف سے معاملہ یا معاہدہ کرتا ہے۔ عبادات میں بھی بعض کام وکالتاً ہوتے ہیں۔ مثلاً قربانی کے جانور کہیں بھیجنا اور دوسرے مقام پر ذبح کرنا ہے۔ علی ہذا القیاس زکوۃ وغیرہ کے معاملات میں بھی وکالت کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ بعض اوقات اس کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس شخص سے معاملہ ہے وہ خود موجود ہو۔ عدالتوں میں بھی اس کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن ہر معاملہ میں اس بات کو ترجیح نہیں دی جا سکتی کہ کام اصالتاً ہی ہو اس لیے کہ یہ بات بہت موجب زحمت ہو جائے گی۔

اس زمانے میں جو وکالت ہو رہی ہے، یعنی وہ پیشہ جو وکالت کے لفظ سے جانا جاتا ہے، تو اس سے انکار نہیں کہ اس کی ضرورت ہے۔ اس زمانے میں قانون ایسا پیچ در پیچ ہے کہ ہر معاملہ میں قانون جاننے والے کی ضرورت پڑتی ہے۔ وکالت کے پیشہ کے جائز ہونے میں کلام نہیں ہے۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ اس میں بے ایمانی نہ ہو اور وکیل اخلاقی حدود و قیود کا پابند ہو۔ احناف کا یہ قول نظر سے گزرا ہے کہ معاملہ اصالتاً ہونا چاہیے۔ میرے نزدیک زندگی کے مختلف گوشوں میں اکثر و بیشتر کام وکالتاً ہی انجام پاتے ہیں، اصالتاً کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ احناف کی رائے بعض خاص معاملات کے بارے میں درست ہے اور اس کے پیش نظر انہوں نے یہ بات کہی ہوگی، پھر لوگوں نے اس کو کلیہ بنا دیا۔

آخر میں اصالتاً کام کی بجائے وکالتاً کام کرنے کے جواز کی ایک شکل امام صاحب نے تعلیق نقل کر کے بتائی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہدی کے جانور قربانی کے لیے حضرت علیؓ کے ہاتھ مکہ بھیجے تھے۔ آپ نے اس میں ان کو شریک بھی کیا تھا اور جانوروں کے گوشت اور کھالوں کو تقسیم کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔

۱۔ حدثنا قبیصۃ حدثنا سفیان عن ابن ابی نجیح عن مجاھد عن عبدالرحمٰن ابن ابی یعلیٰ عن علیؓ قال امرنی رسول اللہ ﷺ ان اتصدق بجلال البدن التی نحرت بجلودھا.

ترجمہ: حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے مجھے حکم دیا کہ قربانی کے اونٹوں کی جھولیں اور کھالیں صدقہ کردوں۔

وضاحت: اس روایت میں اس بات کا ذکر نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو شریک بھی بنایا۔

۲۔ حدثنا عمرو بن خالد حدثنا اللیث عن یزید عن ابی الخیر عن عقبۃ بن عامرٍ ان النبی ﷺ اعطاہ غنماً یقسمھا علی صحابتہ فبقی عتود فذکرہ للنبی ﷺ فقال ضح انت.

ترجمہ: عقبہ بن عامرؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے ان کو بکریاں دیں کہ وہ ان کو صحابہ میں تقسیم کر دیں تو ایک پٹھا بچ رہا۔ انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے کہا اس کو تم قربان کرلو۔

وضاحت: اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طریقہ سے آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کو مامور کیا تھا اسی طرح کسی اور موقع پر آپ نے حضرت عقبہ بن عامرؓ کے حوالہ بکریاں کیں کہ صحابہ میں تقسیم کر دیں۔ قرینہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ جانور خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے ان میں تقسیم کے لیے کہا گیا۔ ایک بکری کا بچہ بچ رہا۔ عتود کا لفظ آیا ہے جس سے مراد ایک سال کا بچہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ضح انت اس کو تم قربان کرلو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ قربانی کا موقع تھا۔ متعین طریقہ سے یہ بتانا مشکل ہے کہ کیا موقع تھا لیکن اس کی تحقیق کی خاص ضرورت بھی نہیں ہے، کیونکہ اصل مضمون وکالت کا ہے۔ عقبہ بن عامرؓ نے وکالت کرتے ہوئے یہ کام انجام دیا اور ان کو اس کی قیمت بھی مل گئی۔

باب ۲: اذا وکل المسلم حربیا فی دارالحرب او فی دارالاسلام جاز

باب: کوئی مسلمان کسی حربی کو دارالحرب میں یا دارالسلام میں اپنا وکیل بنا لے تو جائز ہے۔

حربی سے مراد اس ملک کا باشندہ ہے جس سے حالت جنگ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ کافر ملک

ہو۔ کوئی بھی ملک جس سے مسلمان حالت جنگ میں ہوں دارالحرب ہی کہلائے گا۔ حربی اور دارالحرب کی یہ تعریف جو میں نے کی ہے فقہی اعتبار سے قابل عمل ہے۔ اس کے سوا کچھ مراد لینے میں بڑی مشکلیں ہیں۔ جس ملک کے ساتھ آپ عملاً حالت جنگ میں ہوں تو وہاں کے حربی کو، یعنی وہاں کے باشندہ کو، وکیل بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح وہاں کا کوئی شخص بھی کسی مسلمان کو اپنے معاملات کے لیے وکیل بنا سکتا ہے۔ امام صاحب کے قائم کردہ باب کی رو سے ایسا کرنا جائز ہے۔

۳۔ حدثنا عبدالعزیز بن عبداللہ قال حدثنی یوسف بن الماجشون عن صالح بن ابراھیم بن عبدالرحمٰن بن عوف عن ابیہ عن جدہ عبدالرحمٰن بن عوف قال کاتبت امیۃ بن خلف کتاباً بان یحفظنی فی صاغیتی بمکۃ و احفظہ فی صاغیتہ بالمدینۃ فلما ذکرت الرحمٰن قال لا اعرف الرحمٰن کاتبنی باسمک الذی کان فی الجاھلیۃ فکاتبتہ عبد عمرٍ و فلما کان فی یوم بدرٍ خرجت الی جبلٍ لاحرزہ حین نام الناس فابصرہ بلال" فخرج حتی وقف علی مجلسٍ من الانصار فقال امیۃ بن خلف لا نجوت ان نجا امیۃ فخرج معہ فریق" من الانصار فی اثارنا فلما خشیت ان یلحقونا خلفت لھم ابنہ لاشغلھم فقتلوہ ثم ابوا حتی یتبعونا و کان رجلا ثقیلا فلما ادرکونا قلت لہ ابرک فبرک فالقیت علیہ نفسی لامنعہ فتخللوہ بالسیوف من تحتی حتی قتلوہ و اصاب احدھم رجلی بسیفہ و کان عبدالرحمٰن بن عوف یرینا ذالک الاثر فی ظھر قدمہ.

ترجمہ: حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں کہ میں نے امیہ بن خلف سے ایک تحریری معاہدہ کیا کہ وہ مکہ میں میرے متعلقین میں میرے حقوق کی حفاظت کرے گا اور میں مدینہ میں اس کے متعلقین میں اس کے حقوق کی حفاظت کروں گا۔ تو لکھنے میں جب الرحمٰن کے لفظ کا ذکر آیا تو کہنے لگا کہ میں رحمٰن کو نہیں جانتا تم اپنا نام وہ لکھو جو جاہلیت میں تمہارا رہا ہے تو میں نے عبد عمرو لکھ دیا۔ جب بدر کی لڑائی کا دن آیا تو اس وقت جب تمام لوگ سو گئے میں ایک پہاڑ کی طرف نکلا تاکہ اس کو محفوظ کروں تو بلالؓ نے دیکھ لیا۔ وہ نکلے اور انصار کی ایک مجلس میں پہنچے اور کہا کہ امیہ بن خلف موجود ہے۔ اگر وہ بچ گیا تو سمجھو کہ میں نہیں بچا۔ تو ان کے ساتھ انصار کا ایک گروہ ہمارے تعاقب میں اٹھ کھڑا ہوا۔ جب مجھے اندیشہ ہوا کہ وہ ہم کو پالیں گے تو اس کے بیٹے کو پیچھے کر دیا کہ ذرا اس کے ساتھ الجھے رہیں تو لوگوں نے اس کو قتل کر دیا۔ پھر وہ ہمارے پیچھے آنے پر اڑے رہے۔ امیہ بھاری آدمی تھا۔ جب انہوں نے ہم کو پالیا تو میں نے اسے کہا بیٹھ جا تو وہ بیٹھ گیا اور میں نے اپنے کو اس کے اوپر ڈال دیا تاکہ اس کو حملے سے بچالوں لیکن لوگوں نے نیچے سے تلواریں

گھسا کر اس کو مارا یہاں تک کہ اس کو قتل کر دیا۔ ان میں سے ایک صاحب نے اپنی تلوار میرے پاؤں پر بھی دے ماری۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اپنے پاؤں کے اوپر زخم کا نشان ہمیں دکھاتے بھی تھے۔

وضاحت: امیہ بن خلف قریش سرداروں میں بہت نمایاں حیثیت کا مالک تھا۔ حضرت بلالؓ نے جب اسلام قبول کیا تو اسی سردار کی غلامی میں تھے۔ امیہ ان کو بے حد اذیتیں دیتا اور مطالبہ کرتا کہ وہ نئے دین کو چھوڑ دیں لیکن شدید ترین اذیتیں بھی ان کے قدم جادہ مستقیم سے نہ ہٹا سکیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے امیہ سے بلالؓ کو خرید کر آزاد کر دیا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ قدیم الاسلام صحابی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ امیہ بن خلف کے ساتھ ان کی گہری دوستی تھی جس کے باعث انہوں نے مدینہ کو ہجرت کرتے وقت امیہ سے وہ معاہدہ کیا ہوگا جس کا ذکر اس روایت میں ہے۔

اس روایت میں کئی مشکلات ہیں جن کے حل کرنے پر میں قادر نہیں ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راوی حضرات نے موقع و محل اور پس منظر بالکل غائب کر دیا ہے اس لیے روایت کے تمام اہم نکات میں تطبیق دینا مشکل ہو رہا ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے جو معاہدہ امیہ بن خلف سے کیا تھا اس میں ان کے الفاظ ہیں **یحفظنی فی صاغیتی بمکۃ**. صاغیہ کے معنی وہ تمام متعلقین ہیں جن کے ساتھ آدمی کے معاملات ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کا مطلب یہ ہے کہ مکہ میں میرے متعلقین کے اندر وہ میری حفاظت کرے۔ 'میری حفاظت کرے' کی تاویل ہوگی 'میرے حقوق کی حفاظت کرے' کیونکہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ مدینہ جا رہے تھے۔ معاہدہ کی رو سے عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے مدینہ میں امیہ بن خلف کے حقوق کی حفاظت کرنی تھی۔ گویا معاہدہ مکہ اور مدینہ سے متعلق تھا۔ میدان جنگ کا معاملہ اس میں شامل نہیں ہو سکتا، میدان جنگ کی بات اور ہوتی ہے۔ روایت میں ذکر ہے 'فی یوم بدر' گویا جب امیہ بن خلف بدر کی لڑائی میں گیا تو لڑائی کے بعد جو بھگدڑ مچی اس میں کچھ لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ ان میں بڑے بڑے لوگ بھی تھے۔ کچھ لوگ بچ بھی گئے ہوں گے، امیہ ان میں رہا ہوگا۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو خیال ہوا کہ میں اس کو بچانے کی کوشش کروں۔ اگر یہ انہوں نے معاہدہ کے احترام میں کیا تو میدان جنگ میں اس کو بچانے کا انہیں کوئی حق نہیں تھا۔ ان کی یہ پوزیشن غلط ہے اس لیے کہ جو شخص میدان جنگ میں لڑنے کے لیے آیا ہو اس کے لیے تلوار فیصلہ کن ہوتی ہے۔ کوئی ذاتی معاہدہ اس موقع پر کام نہیں دے سکتا۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات عبدالرحمٰنؓ کے علم میں نہ رہی ہوگی کہ دشمن جو میدان جنگ میں لڑنے کے لیے آئے وہ محارب ہے، اس کے لیے کسی معاہدے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس روایت میں دوسری مشکل یہ ہے کہ اسلام میں قانون یہ ہے کہ کوئی ادنیٰ مسلمان بھی کسی کو

اندیشہ کے تحت وکیل کی وکالت کے حق کو نہیں سلب کیا جا سکتا۔ علی ہذا القیاس چرواہے لوگوں کی بکریاں چراتے ہیں تو یہ ممکن ہے کوئی بکری بیمار ہو جائے یا کوئی بھیڑیا اس کو زخمی کر دے اور وہ ہلاکت کے قریب ہو جائے تو اس صورت میں خود بکری کے مالک کے مفاد میں ہے کہ اس کو ذبح کر لیا جائے۔ اس کے لیے مالک سے پیشگی اجازت لینا ضروری ہو تو بکری تو ہلاک ہو جائے گی۔ لہٰذا اس صورت میں بطور وکیل قدم اٹھانے کی اجازت ہے۔

۵۔ حَدَّثَنَا إِسْحَاقُ بْنُ إِبْرَاهِيمَ سَمِعَ الْمُعْتَمِرَ قَالَ أَنْبَأَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ عَنْ نَافِعٍ أَنَّهُ سَمِعَ ابْنَ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ يُحَدِّثُ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ كَانَتْ لَهُمْ غَنَمٌ "تَرْعَى بِسَلْعٍ فَأَبْصَرَتْ جَارِيَةٌ" لَنَا بِشَاةٍ مِنْ غَنَمِنَا مَوْتًا فَكَسَرَتْ حَجَرًا فَذَبَحَتْهَا بِهِ فَقَالَ لَهُمْ لَا تَأْكُلُوا حَتَّى أَسْأَلَ النَّبِيَّ ﷺ أَوْ أُرْسِلَ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ مَنْ يَسْأَلُهُ، وَ إِنَّهُ سَأَلَ النَّبِيَّ ﷺ عَنْ ذَاكَ أَوْ أَرْسَلَ فَأَمَرَهُ بِأَكْلِهَا قَالَ عُبَيْدُ اللّٰهِ فَيُعْجِبُنِي أَنَّهَا أَمَةٌ" وَ أَنَّهَا ذَبَحَتْ تَابَعَهُ عَبْدَةُ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ.

ترجمہ: کعب بن مالک اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے پاس بکریوں کا ایک ریوڑ تھا اور سلع کے مقام پر وہ چرائی جاتی تھیں۔ ہماری ایک لونڈی نے ایک بکری کو دیکھا کہ مر رہی ہے تو اس نے ایک پتھر توڑا اور اس سے اس کو ذبح کر ڈالا۔ مالک نے کہا کہ کھاؤ نہیں جب تک کہ ہم نبی ﷺ سے پوچھ نہ لیں یا یہ بات ہوئی کہ نبی ﷺ کی خدمت میں ایک شخص کو بھیجا گیا کہ وہ پوچھے یا یہ کہ آپ نے اپنا حکم بھیجا کہ کھایا جا سکتا ہے۔ عبیداللہ کہتے ہیں کہ مجھے اچھی بات یہ لگی کہ ایک لونڈی تھی جس نے اس کو ذبح کیا۔

وضاحت: آج تک ہم سنتے تھے کہ عورت کسی جانور کو ذبح کر دے تو ذبیحہ جائز نہیں ہوتا۔ دیہاتیوں میں یہ خیال پایا جاتا ہے۔ اس روایت سے یہ معلوم ہو گیا کہ عورت کو یہ حق حاصل ہے اور اس معاملہ میں وہ مردوں کے مساوی ہے۔

لونڈی نے پتھر کو توڑا۔ ایسا کرنے سے وہ نوکیلا ہو گیا، اس میں یہ بات مضمر ہے کہ اس نے اس پتھر سے بکری کو ذبح کر دیا تو اس سے خون بہہ جانے کی شرط پوری ہو گئی۔ ذبح کے لیے چھری ہی ضروری نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے کہ چھری تلاش کی جاتی تو اس کے ملنے تک بکری دم توڑ جاتی۔ بہرحال یہ مسئلہ واضح ہو گیا کہ عورت بھی ذبح کر سکتی ہے، آلۂ ذبح ایک ضمنی چیز ہے۔

باب ۵: وكالة الشاهد والغائب جائزة وكتب عبدالله بن عمرو الى قهرمانه وهو غائب عنه ان يزكي عن اهله الصغير والكبير.

باب: مبادلہ کی شرح میں وکالت، چاہے وہ موزوں ہو یا غیر موزوں۔ عمرؓ اور ابن عمرؓ نے مبادلہ کے سلسلہ میں وکیل کیا۔

عنوان باب میں صرف سے مراد دینار اور درہم کا مبادلہ ہے۔

۴۔ حَدَّثَنَا عَبْدُاللّٰهِ بِنْ يُوسُفَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ" عَنْ عَبْدِالْمَجِيدِ بْنِ سُهَيْلِ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ عَنْ سَعِيدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ اَبِي سَعِيدِ الْخُدْرِيِّ وَ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا عَلٰى خَيْبَرَ فَجَاءَهُمْ بِتَمْرٍ جَنِيبٍ فَقَالَ اَكُلُّ تَمْرِ خَيْبَرَ هٰكَذَا فَقَالَ لَا اِنَّا لَنَاخُذُ الصَّاعَ مِنْ هٰذَا بِالصَّاعَيْنِ وَ الصَّاعَيْنِ بِالثَّلٰثَةِ فَقَالَ لَا تَفْعَلْ بِعِ الْجَمْعَ بِالدَّرَاهِمِ ثُمَّ ابْتَعْ بِالدَّرَاهِمِ جَنِيبًا وَ قَالَ فِي الْمِيزَانِ مِثْلَ ذٰلِكَ۔

ترجمہ: ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو خیبر کو عامل بنایا تو وہ وہاں سے عمدہ کھجور لے کر آیا۔ آپ نے پوچھا، کیا خیبر کے سارے کھجور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس نے کہا، نہیں حضورؐ! ہم ایک صاع یہ کھجور دو صاع کے بدلے اور دو صاع یہ کھجور تین صاع کے بدلے میں لیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا ایسا مت کرو بلکہ اپنی کھجور درہموں کے بدلے بیچ ڈالو، پھر ان درہموں سے عمدہ کھجور خرید لو۔ تولنے کی چیزوں میں بھی یہی طریقہ اختیار کرنے کا آپ نے حکم دیا۔

وضاحت: یہ روایت کتاب البیوع میں گزر چکی ہے۔ وہاں اس پر مفصل بحث کر کے یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ابتدا میں نبی ﷺ نے یہ بات فرمائی ہوگی لیکن دوسری روایت بھی موجود ہے کہ جب اصناف مختلف ہوں تو جس طرح چاہیں خرید و فروخت کر سکتے ہیں۔

باب ۴: اذا ابصر الراعی او الوکیل شاۃ تموت او شیا یفسد ذبح و اصلح ما یخاف علیه الفساد

باب: کوئی چرواہا یا آدمی کا وکیل اگر دیکھے کہ بکری مر رہی ہے یا کوئی شے خراب ہو رہی ہے تب وہ بکری کو ذبح کر دے یا اس شے کی اصلاح کر دے۔

وضاحت: یہاں امام صاحب نے وکیل کا لفظ خاص طریقہ پر استعمال کیا ہے۔ یہ کامن سنس کا تقاضا ہے کہ کوئی چیز خراب ہو رہی ہو تو مالک سے پوچھنے کی کوئی ضرورت نہیں، وکیل خود ٹھیک کر دے۔ مگر اس معاملہ میں یہ بات ہے کہ وکیل مال کو ہڑپ کر لینے کے لیے یہ راستہ اختیار نہ کرے۔ یہ خطرہ تو ہے لیکن اس

بے ترتیبی کی صورت میں بھی، ان کے نزدیک، وضو بہر حال ہو جائے گا، تاہم بے ترتیبی کے نتیجہ میں کچھ نہ کچھ خرابی تو وضو میں پیدا ہو ہی جائے گی۔

میرے نزدیک ترتیب کے معاملے میں شوافع کی رائے نہایت مضبوط ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ترتیب قرآن مجید میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب بیان کرنا قرآن کا مقصود ہے۔ لہذا یہ ترتیب فرضیت کا درجہ رکھتی ہے۔ ترتیب کی فرضیت کے اپنے وجوہ ہیں۔ اول تو یہ ایک بالکل فطری ترتیب ہے کہ پہلے منہ دھوئیں، اس کے بعد ہاتھ دھوئیں، پھر سر کا مسح کریں اور آخر میں اپنے پاؤں دھوئیں۔ دوسرا اسی اہتمام کو ظاہر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے آیت وضو کے لفظ اَرْجُلَكُمْ کو جو اَيْدِيَكُمْ کا معطوف ہے، رُءُوسِكُمْ کے بعد رکھا۔ اگر ترتیب ملحوظ نہ ہوتی تو اس اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ اس ضمن میں ہمارے بعض علماء نے جو اختلاف قرأت کا سہارا لیا ہے تو اس کی اصلاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک وَ اَرْجُلَكُمْ فَاغْسِلُوْا کے تحت ہے، وَامْسَحُوْا کے تحت نہیں ہے۔

عبداللہ بن زیدؓ نے نبی ﷺ کا عمل سر کے مسح میں اس طرح بتایا کہ وہ ہاتھوں کو پہلے آگے سے پیچھے کی طرف لے گئے اور پھر واپس آگے کی طرف لے آئے۔ معلوم ہوا کہ آنحضرت ﷺ بہت اہتمام سے سر کا مسح کرتے تھے جس میں پورے سر کا احاطہ ہو جاتا تھا۔ قرآن مجید میں اس ذیل میں جو حکم ہے وہ ان الفاظ میں ہے وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ مسح کے معنی ہاتھ پھیرنے کے ہیں۔ یہاں فعل (وَامْسَحُوْا) اور اس کے صلہ (ب) میں مناسبت نہیں ہے۔ عربیت کا یہ معروف اسلوب ہے کہ جب فعل اور صلہ میں مناسبت نہ ہو تو لازماً وہاں ایسا کوئی لفظ مقدر مانیں گے جو صلے سے مطابقت رکھتا ہو۔ یہاں بھی عبارت اس وقت پوری طرح بامعنی ہوگی جب کوئی ایسا لفظ لائیں گے جو 'ب' کے صلے کے ساتھ مناسبت رکھتا ہو۔ مثلاً وَامْسَحُوْا مُحِيْطِيْنَ بِرُءُوْسِكُمْ۔ یعنی تم اپنے سروں کا مسح کرو ان کا احاطہ کرتے ہوئے۔ اس وجہ سے وضو میں پورے سر کا مسح مطلوب ہے اور میں اسی کا قائل ہوں البتہ پگڑی باندھنے کی صورت میں رفع زحمت کے لیے سر کے جزوی مسح کی بھی اجازت ہے۔ مسح کے معاملے میں مالکیہ کا مذہب قرآن کے مطابق ہے۔ شوافع کہتے ہیں کہ جتنے کے اوپر مسح کا اطلاق ہو جائے اتنا مسح کفایت کرے گا۔ وہ کسی تقید پر نہیں جاتے۔ میرے نزدیک ان کی یہ رائے صحیح نہیں۔ حنفیہ ربع سر (یعنی چوتھائی سر) کے مسح کو کافی سمجھتے ہیں۔ وہ چوتھائی سر کا جواز کہاں سے لیتے ہیں؟ یہ ایک بے دلیل بات ہے، جو عربیت کے بھی خلاف ہے، قرآن مجید کے بھی خلاف ہے اور سنت ثابتہ کے بھی خلاف ہے۔

رہا یہ سوال کہ کان اور گردن کا مسح حضرت عبداللہ بن زیدؓ نے نہیں کیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا تعلق

امان دے دے گا تو سب کو اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ روایت کی رو سے اس قانون کی خلاف ورزی کی گئی۔ اب کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ حضرت بلالؓ اور انصاری صحابہ نے اس کی خلاف ورزی کی۔ یہ سب سوالات اس لیے پیدا ہوئی ہیں کہ واقعہ کا صحیح پس منظر اور اس کا وقت نہیں بتایا گیا۔ قیاس سے کام لے کر یہ طے کرنا پڑے گا کہ بدر کے موقع پر امیہ بن خلف الگ ہو کر کہاں تھا۔ کیا وہ میدان جنگ میں نہیں تھا اور یہ واقعہ کس وقت پیش آیا۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کہتے ہیں کہ سب سو چکے تھے تو میں اٹھا کہ اس کو بچاؤں تو کس رات کا یہ واقعہ ہے۔ لڑائی سے پہلے کی رات کا یا اس کے بعد کی رات کا۔ اگر پہلی رات کا ہے تو اس کا ایک محل ہو سکتا ہے کہ حضرت عبدالرحمٰنؓ نے اپنے دوست کو جنگ کے منظر سے ہٹانے کی کوشش کی ہو کہ وہ شریک نہ ہو کر اپنے کو بچا لے اور وہ اس کو اپنی حفاظت میں کسی پہاڑ کی طرف لے جا رہے ہوں۔ لیکن اگر یہ بعد کی رات کا معاملہ ہے، جیسا کہ روایت سے مترشح ہوتا ہے، تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ لڑائی کے بعد عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اپنے عہد و پیمان کا خیال آیا تو انہوں نے جان کی بازی کھیل کر امیہ کو بچانے کی کوشش کی۔ یہ بات ہے تو شرافت کی لیکن قانونی طور پر یہ سوال ہے کہ میدان جنگ میں آنے والے دشمن کو اس طریقہ سے بچانے کی یہ کوشش کیا ان کے لیے جائز تھی۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے معاہدہ کے احترام میں ایسا کیا، شریفانہ جذبہ کے تحت کیا، لیکن خلاف قانون کیا۔ حضرت بلالؓ نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے پہلے آنحضرت ﷺ کا یہ اعلان نہیں ہوا تھا کہ مسلمانوں میں سے کوئی آدمی کسی کو پناہ دے دے گا تو سب کو اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ یہ اعلان تو میثاق مدینہ میں موجود ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ اعلان اس شخص کے لیے مفید نہیں ہو سکتا جو بالفعل میدان جنگ میں لڑنے کے لیے آیا ہو اور وہ بھی جنگ بدر میں جو کفر اور اسلام کی فیصلہ کن جنگ تھی۔ حضرت بلالؓ کا جوش بالکل برحق تھا اور ان کے ساتھیوں کا عمل بھی معقول تھا۔ واقعہ سے انکار نہیں لیکن اس کی صحیح شکل سامنے نہیں اس وجہ سے مشکل پیش آتی ہے۔ واللہ اعلم عنداللہ۔

امیہ بن خلف نے لفظ رحمٰن پر جو اعتراض کیا تو یہ اسی طرح کی عصبیت تھی جس کا اظہار کفار قریش نے معاہدہ حدیبیہ کے موقع پر کیا تھا۔ امیہ کا اصرار تھا کہ عبدالرحمٰن بن عوف اپنا قدیم نام عبد عمرو معاہدہ میں لکھیں، اسلامی نام عبدالرحمٰن نہ لکھیں۔ حدیبیہ میں تحریر معاہدہ کے وقت کفار کا اصرار تھا کہ 'محمد رسول اللہ' کے الفاظ کے بجائے 'محمد بن عبداللہ' کے الفاظ لکھے جائیں کیونکہ اصل جھگڑا تو اسی بات پر ہے کہ ہم آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے اور آپ اپنی اس حیثیت کو ہم سے منوانا چاہتے ہیں۔

باب ۳: الوكالة فى الصرف و الميزان و قد وكل عمر و ابن عمر فى الصرف

باب: موجود یا غیر حاضر آدمی کو وکیل بنانا جائز ہے۔ عبداللہ بن عمرو نے اپنے منشی کو لکھا، حالانکہ وہ وہاں نہیں تھا کہ وہ ان کے چھوٹے بڑے سب کی طرف سے زکوٰۃ ادا کرے۔

قہرمان فارسی لفظ ہے اور منشی کے معنی میں ہے۔ اس طرح کے تمدنی اور اجتماعی زندگی سے متعلق الفاظ عربی میں بیشتر فارسی اور یونانی سے لیے گئے ہیں۔

باب میں جو تعلیق دی گئی ہے وہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ ہر چند منشی غائب ہے۔ آپ اس کو وکیل بنا سکتے ہیں۔ اس روایت میں نام عبداللہ بن عمروؓ کا ہے بعض روایات میں عبداللہ بن عمرؓ کا نام ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ ہی ہوگا۔ ان کی زمین مدینہ سے کچھ فاصلہ پر تھی اور وہ خود مدینہ ہی میں قیام فرماتے تھے۔ زمین پر منشی رکھا ہوا تھا۔ اس کو ہدایت دیتے تھے اور کبھی کبھی زمین پر بھی تشریف لے جاتے تھے۔

۲۔ حَدَّثَنَا ابو نعيم حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عن سَلَمَةَ بن كُهَيْلٍ عن سلمة عن ابى هُرَيْرَةَؓ قَالَ كَانَ لِرَجُلٍ عَلَى النبى ﷺ جمل سِنٌّ من الابل فَجَاءَهُ يَتَقَاضَاهُ فَقَالَ اعْطُوهُ فَطَلَبُوا سِنَّهُ فَلَم يَجِدُوا لَهُ إِلَّا سِنًّا فوقها فَقَالَ اعْطُوهُ فَقَالَ اَوْفَيْتَنِى اَوْفَى اللهُ بِكَ قَالَ النبى ﷺ إِنَّ خِيَارَكُم أَحْسَنُكُمْ قَضَاءً.

ترجمہ: حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے ذمہ ایک شخص کا ایک خاص عمر کا اونٹ آتا تھا۔ وہ تقاضا کرنے آیا تو آپ نے حکم دیا کہ اس کو دے دو۔ لوگوں نے اس عمر کا اونٹ تلاش کیا تو نہیں ملا۔ اونٹ اس سے زیادہ عمر کے تھے۔ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اس کو یہی دے دو۔ اس شخص نے کہا آپ نے میرا حق بہت پورا کیا، اللہ تعالیٰ آپ کے لیے پورا کرے۔ نبی ﷺ نے فرمایا تم میں سب سے زیادہ اچھا وہ ہے جو ادائیگی کرنے میں بہتر ہو۔

وضاحت: یہ جو نبی ﷺ نے آدمی کو اس کے حق سے زیادہ دیا تو اس پر فرمایا کہ میں نے کوئی عجیب بات نہیں کی بلکہ اخلاق کا تقاضا یہی ہے کہ دیجیے تو بہتر سے بہتر دیجیے۔ یہ سود نہیں ہے، اس کو سود بنا دینا اخلاق کو ختم کر دینا ہے۔ ایسا معاملہ نقد میں بھی ہو سکتا ہے۔ امام صاحب نے یہ موجود شخص کو وکیل بنانے کی دلیل پیش کی ہے۔ باب کے تحت غائب کی وکالت کی کوئی روایت نہیں ہے، صرف عنوان باب میں ایک تعلیق نقل ہے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

تفصیلات، جزئیات اور آداب واضح ہوتے ہیں۔ قرآن میں وہ تمام چیزیں چھوڑ دی گئی ہیں جو بنیادی چیزوں میں سے نہیں تھیں۔ کسی مضمون کے فلسفہ و حکمت کو قرآن حکیم سے سمجھا جا سکتا ہے لیکن ایک عمل کے تمام اطراف کو جب تک سنوارا نہ جائے اس کے حسن کی تکمیل نہیں ہوتی۔ یہ کام سنت کا اتباع کر کے ممکن ہوتا ہے۔ اس میں اس کے اطراف و جوانب اور لوازم سب چیزیں آ جاتی ہیں۔

آیت وضو (مائدہ: ۵۔۶) میں جو فرائض وضو بیان ہوئے وہ یہ ہیں۔ منہ دھونا، دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھونا، سر کا مسح کرنا اور دونوں پاؤں ٹخنوں تک دھونا۔ یہ وضو کی اساسات اور بنیادی چیزیں بتائی ہیں۔

روایت کے الفاظ میں وَضُوْء" سے مراد وضو کا پانی ہے۔ یہی لفظ واو پر ضمہ (پیش) کے ساتھ وضو کے معنی میں آتا ہے۔

تَمَضْمَضَ : مضمضہ کلی کرنے کے معنی میں آتا ہے۔ مراد ہے انہوں نے کلی کی۔

اِسْتَنْثَرَ: استنثار یعنی ناک کو صاف کرنا۔ یہ استنشاق یعنی ناک میں پانی سڑکنے کے بعد کا عمل ہے۔ گویا وضو کرتے ہوئے پہلے ناک میں پانی سڑکا جائے گا اور پھر ناک جھاڑی جائے گی۔

اَلْمِرْفَقَیْن: مرفق کہنی کے لیے آتا ہے۔

قرآنی فرائض کے علاوہ کلی کرنا، ناک میں پانی سڑکنا اور بعد میں ناک کو صاف کرنا بھی وضو میں شامل ہے۔ نبی ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے سے اعمال میں حسن اور زندگی میں ایک ضابطہ اور نظام پیدا ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن زیدؓ کی یہ روایت وضو پر جامع روایات میں سے ایک ہے۔ اس کے مطابق صحیح وضو کے لیے پہلے ہاتھ دھوئیں۔ اس کے بعد مضمضہ یعنی کلی کریں۔ اس کے بعد ناک میں پانی سڑکیں اور استنثار یعنی ناک کو صاف کریں۔ یہ تمام تفصیلات قرآن میں نہیں ہیں۔ اس کے بعد منہ دھوئیں پھر کہنیوں تک بازوؤں کو دھوئیں۔ اس پر یہ قید نہیں لگائی گئی کہ کتنی مرتبہ دھونا ہے۔ یہ آپ پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد سر کے مسح کا ذکر ہے اور آخر میں پاؤں دھونے کا بیان ہے۔ عبداللہ بن زیدؓ نے سر کا مسح اس طرح کیا کہ اپنے ہاتھوں کو پیشانی کی طرف سے سر کے پیچھے تک لے گئے۔ پھر ان کو پیچھے سے مسح کرتے ہوئے واپس آگے تک لے آئے۔

اب رہا یہ سوال کہ وضو میں اس ترتیب کی حیثیت کیا ہے؟ شوافع کی رائے میں یہ فرض ہے۔ ان کے نزدیک اگر ترتیب کو الٹ پلٹ کر دیا جائے گا تو وضو نہیں ہوگا۔ احناف ترتیب کو سنت مانتے ہیں۔

ایسا کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ حدث کبیر میں اگر پتھر یا ڈھیلے کے ذرائع کو کافی سمجھا جا سکتا ہے تو پیشاب کے معاملے میں اس کو نا کافی سمجھنے کی کوئی علت نہیں ہے۔

امام مالک کے فتوے:

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک اس شخص کے عمل میں، جو ایک ہی چلو سے کلی کرتا اور ناک صاف کرتا ہے، کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے ایک ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا گیا جس نے وضو کیا تو بھول گیا۔ اس نے کلی کرنے سے پہلے اپنا منہ دھولیا یا منہ دھونے سے پہلے اپنی دونوں بانہیں دھولیں۔ امام مالک نے یہ فتویٰ دیا کہ جس نے اپنا منہ، کلی سے پہلے، دھولیا ہے اس کو تو چاہیے کہ کلی کر لے اور اپنے چہرے کے دھونے کا اعادہ نہ کرے۔ رہا وہ کہ جس نے منہ دھونے سے پہلے اپنے ہاتھ دھو لیے ہیں تو وہ اب اپنا منہ دھولے، پھر وہ اپنے ہاتھوں کو دوبارہ دھوئے تاکہ ان کا دھونا منہ دھونے کے بعد ہو جائے جب کہ وہ ابھی اپنی (وضو کی) جگہ پر یا اس کے قریب ہی موجود ہو۔

گویا امام صاحب کے فتوئ کی رو سے کلی کی ترتیب بدل جانے سے تو کوئی فرق واقع نہیں ہوگا لیکن ہاتھوں کو منہ دھونے سے پہلے دھو لینے سے دوبارہ صحیح ترتیب کے ساتھ اعضا کو دھونا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری صورت میں ترتیب میں بنیادی تبدیلی ہوگئی ہے حالانکہ وضو میں اعضا دھونے کی ترتیب قائم رکھنا فرض ہے۔ لہٰذا اعادہ ضروری ہوگا۔

یحییٰ کہتے ہیں کہ امام مالک سے ایک ایسے شخص کے متعلق پوچھا گیا کہ جو (وضو میں) کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا بھول گیا، یہاں تک کہ اس نے نماز پڑھ لی۔ تو انہوں نے کہا کہ اس کے لیے اپنی نماز کا اعادہ کرنا ضروری نہیں۔ بلکہ یہ ہے کہ آگے کے لیے وہ کلی کرے اور ناک صاف کرے، اگر نماز پڑھنے کا ارادہ رکھتا ہو۔

امام مالک کے نزدیک کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا چونکہ وضو کے بنیادی احکام میں سے نہیں ہے، جیسا کہ قرآن مجید کی صراحت سے معلوم ہوتا ہے، اس لیے اگر سہواً یہ اعمال رہ جائیں اور نماز پڑھی جا چکی ہو تو ایسے نمازی کے لیے اعادہ نماز ضروری نہیں ہے۔ البتہ اگلی نماز کے لیے وہ کلی کرلے اور ناک صاف کرلے تاکہ تکمیل وضو ہو جائے۔ چونکہ یہ دونوں اعمال وضو کے بنیادی احکام میں سے نہیں ہیں اس لیے اس میں سہو پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔

(ترتیب: ماجد خاور)

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

درس موطا امام مالکؒ

(موطا امام مالک کی کتاب الطہارۃ کی روایات)

(۱) باب العمل فی الوضوء

باب: وضو کا طریق کار

۱. حَدَّثَنِي يَحْيَى عَنْ مَالِكٍ عَنْ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ عَنْ أَبِيهِ أَنَّهُ قَالَ لِعَبْدِ اللَّهِ ابْنِ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ. وَهُوَ جَدُّ عَمْرِو بْنِ يَحْيَى الْمَازِنِيِّ وَ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ: هَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُرِيَنِي كَيْفَ، كَانَ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ يَتَوَضَّأُ؟ فَقَالَ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ زَيْدِ بْنِ عَاصِمٍ: نَعَمْ. فَدَعَا بِوَضُوءٍ. فَأَفْرَغَ عَلَى يَدِهِ فَغَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ تَمَضْمَضَ وَاسْتَنْثَرَ ثَلَاثًا. ثُمَّ غَسَلَ وَجْهَهُ ثَلَاثًا. ثُمَّ غَسَلَ يَدَيْهِ مَرَّتَيْنِ مَرَّتَيْنِ إِلَى الْمِرْفَقَيْنِ. ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَهُ بِيَدَيْهِ فَأَقْبَلَ بِهِمَا وَ أَدْبَرَ بَدَأَ بِمُقَدَّمِ رَأْسِهِ. ثُمَّ ذَهَبَ بِهِمَا إِلَى قَفَاهُ. ثُمَّ رَدَّهُمَا حَتَّى رَجَعَ إِلَى الْمَكَانِ الَّذِي بَدَأَ مِنْهُ. ثُمَّ غَسَلَ رِجْلَيْهِ.

ترجمہ: عمرو بن یحییٰ مازنی اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے عبداللہ بن زید بن عاصم، جو کہ عمرو بن یحییٰ مازنی کے دادا اور رسول اللہ ﷺ کے صحابی ہیں، سے کہا کہ کیا آپ یہ زحمت فرما سکتے ہیں کہ مجھے بتا دیں کہ رسول اللہ ﷺ کس طرح وضو کرتے تھے؟ تو عبداللہ بن زید بن عاصم نے کہا کہ ہاں! میں یہ کر سکتا ہوں۔ تو انہوں نے وضو کے لیے پانی منگوایا۔ پھر انہوں نے اپنے ہاتھ پر ڈالا اور اپنے دونوں ہاتھ دو دو مرتبہ کر کے دھوئے۔ پھر کلی کی اور ناک صاف کی تین مرتبہ۔ پھر انہوں نے اپنا منہ دھویا تین مرتبہ۔ پھر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ کہنیوں تک دھوئے دو دو مرتبہ۔ پھر انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کا مسح کیا۔ پس ان کو آگے بھی لے گئے اور پیچھے بھی۔ انہوں نے اپنے سر کے اگلے حصے سے شروع کیا اور ہاتھوں کو پیچھے تک لے گئے۔ پھر ان کو لوٹایا یہاں تک کہ اسی جگہ واپس لائے جہاں سے شروع کیا تھا۔ پھر اپنے دونوں پاؤں دھوئے۔

وضاحت: قرآن مجید میں وضو کے اصولی اور اساسی احکام بیان ہوئے ہیں جبکہ حدیث سے وضو کی

سنت سے نہیں بلکہ مستحبات سے ہے جو وضو کی تکمیل کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔ میں مسح کے بارے میں کان کو سر کا حصہ سمجھتا ہوں، اس سے الگ نہیں، البتہ گردن اس سے الگ ہے۔ لہذا میرے نزدیک کان کا مسح سر کے مسح ہی میں مانا جائے گا۔

جہاں تک اعضاء کے دھونے کی تعداد کا تعلق ہے تو روایات میں ایک مرتبہ، دو مرتبہ اور تین مرتبہ دھونے کا حکم ہے۔ گویا اس کا تعلق حالات سے اور پانی کے میسر آنے پر ہے۔ اگر پانی کم ہے یا آپ محض وضو کی تجدید چاہتے ہیں تو ایک مرتبہ دھونے سے بھی وضو ہو جائے گا۔ اگر ایک آدمی کسی ورکشاپ میں کام کر کے آیا ہے تو وہ جسم کی صفائی کے لیے تین مرتبہ دھونا بھی ناکافی سمجھے گا۔ لہذا اس معاملہ میں فیصلہ وضو کرنے والا خود کر سکتا ہے۔

۲. وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ أَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْأَعْرَجِ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: إِذَا تَوَضَّأَ أَحَدُكُمْ فَلْيَجْعَلْ فِي أَنْفِهِ مَاءً ثُمَّ لِيَنْثِرْ وَمَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوتِرْ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی وضو کرے تو چاہیے کہ وہ اپنی ناک میں پانی ڈالے پھر اس کو صاف کرے، اور جو استنجا کرے تو چاہیے کہ طاق لے۔

۳. وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ أَبِي إِدْرِيسَ الْخَوْلَانِيِّ عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ قَالَ: مَنْ تَوَضَّأَ فَلْيَسْتَنْثِرْ وَ مَنِ اسْتَجْمَرَ فَلْيُوتِرْ.

ترجمہ: حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو وضو کرے تو اس کو چاہیے کہ وہ پانی ناک میں ڈال کر اس کو صاف کرے اور جو (استنجا کے لیے) پتھر لے تو طاق لے۔

وضاحت:

لِيَنْثِرْ: ناک (میں پانی ڈالنے کے بعد اس) کو صاف کرے۔

اِسْتَجْمَرَ: نجاست صاف کرنے کے لیے پتھر، کنکری یا ڈھیلا لینا۔ یہ استنجا کی ایک شکل ہے۔

فَلْيُوتِرْ: وتر یعنی طاق لینا۔

اس روایت میں وضو کے دوران ناک صاف کرنے کا حکم ہے جس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ جہاں تک استنجا کا تعلق ہے، اہل عرب میں اس کا عام طریقہ یہ تھا کہ وہ پتھر، کنکری یا ڈھیلے کے قسم کی کوئی چیز لیتے تھے جس سے رطوبت فاسدہ صاف ہو سکے۔ ہمارے ملکوں میں پانی کی بہتات ہے لیکن عرب کے ملک میں اتنا وافر پانی نہیں تھا۔ اس لیے ان کے ہاں پانی سے استنجا کو مردوں کے لیے تکلف

الوضوء سے مراد نہایت اہتمام سے مفصل وضو کرنا ہے۔

وَیْلٌ: ہلاکی   اَعْقَاب: یعنی ایڑیاں۔ اس کا واحد عقب ہے۔

وضو مخلص اور منافق میں امتیاز کے لیے بہت بڑی کسوٹی ہے۔ ہر موسم میں وضو کے اہتمام کا معاملہ مومن اور منافق کو ابتلاء سے دوچار رکھتا ہے۔ میری رائے میں اس کسوٹی سے آدمی کا ایمان و نفاق بڑی آسانی کے ساتھ پکڑا جا سکتا ہے۔

بعض لوگوں نے اسباغ وضو کے حکم کا 'غسل' کے لفظ سے استنباط کیا ہے۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ قرآن حکیم میں وَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ کے الفاظ ہیں۔ غسل میں اسالت ماء ضروری ہے۔ اس مفہوم میں صرف مسح کر لینا یا لیپنا نہیں ہے بلکہ پانی بہانا داخل ہے۔ اس سے کم تر معنی میں دیگر الفاظ مثلاً مسح وغیرہ آتے ہیں۔ اگر آپ نے اعضائے وضو پر صرف پانی لیپ لیا ہے تو یہ اس لفظ کی روح کے خلاف ہے۔ اگر انجانے میں یا پانی کی کمی کی صورت میں بھی ایسا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔ وہ ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کو معاف فرمانے والا ہے۔

روایت کے الفاظ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وضو میں جو تساہل ہو گا وہ ایڑیوں میں زیادہ ہو گا اسی لیے اس میں احتیاط کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ بہت سے لوگ ہوں گے جو وضو کے دوران ایڑیوں کو بے احتیاطی سے دھونے کے باعث پکڑے جائیں گے۔

۵. وَ حَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ عَنْ يَحْيَى بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ طَحْلَاءَ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ أَنَّ أَبَاهُ حَدَّثَهُ أَنَّهُ سَمِعَ عُمَرَبْنَ الْخَطَّابِ يَتَوَضَّأُ بِالْمَاءِ لِمَا تَحْتَ إِزَارِهِ.

ترجمہ: عثمان بن عبدالرحمن اپنے باپ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ پانی سے دھوتے تھے اپنے تہمد کے نیچے کی چیز کو۔

وضاحت:

يَتَوَضَّأُ: یہ لفظ یہاں دھونے کے معنی میں آیا ہے۔

لِمَا تَحْتَ إِزَارِهِ: زیر تہمد یعنی بول و براز کے مقام کو۔

اس روایت میں استنجا کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا معمول بیان کیا گیا ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے پانی کا استعمال فرمایا کرتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ وہ پتھر یا ڈھیلے وغیرہ سے استنجا کو کافی نہیں سمجھتے رہے ہوں گے۔ یہاں ان کے عمل کی توجیہ نہیں بیان کی گئی ہے۔ اس لیے اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ پیشاب کرنے کے بعد پانی سے دھونا ضروری ہے۔ میرے نزدیک یہ ضروری نہیں ہے اس لیے کہ

امور غیب کے بارے میں رہنمائی جیسی چیزوں کا اہتمام ہوتا۔ وہ اس کو کسی جن سے رابطہ کا نتیجہ قرار دیتے۔

قریش کا پروپیگنڈا درست نہیں تھا۔ اس کے اسباب بالکل واضح ہیں۔ اولاً یہ کہ شاعروں کی شاعری ان کے احساسات و جذبات اور وجدان پر مبنی ہوتی ہے۔ ان کے دل پر جو کچھ وارد ہوتا ہے وہ اس کو کسی اچھوتے اسلوب میں شعر موزوں کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ انھیں اس سے بحث نہیں ہوتی کہ اگر کل انھوں نے کسی نیک جذبہ کے تحت اچھا شعر کہا تھا تو آج اس کے برعکس بے حیائی کا مضمون کیوں باندھ رہے ہیں۔ بڑے سے بڑے شاعر کا کلام پرکھیے تو معلوم ہو گا کہ وقتی جذبات و احساسات کے تحت انھوں نے نیک اور بد ہر طرح کی باتیں کہہ رکھی ہیں۔ ان کے جوانی اور بڑھاپے کے کلام میں نمایاں فرق دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک جگہ وہ رند شاہد باز نظر آتے ہیں تو دوسرے مقام پر پارسا اور ولی دکھائی دیتے ہیں۔ ثانیاً، شاعر صرف گفتار کے غازی ہوتے ہیں، کردار کی ان کے ہاں اہمیت نہیں ہوتی۔ ان کے کلام میں اللہ و رسول کی اطاعت کا پیغام ہو گا لیکن اپنا عمل اطاعت کے معانی سے نا آشنا ہو گا۔ وہ مسائل تصوف بیان کریں گے لیکن اپنا محبوب شغل بادہ خواری ہو گا۔ رجزیہ کلام میں شجاعت و شہامت کا مضمون باندھتے ہوئے آسمان اور زمین کے قلابے ملا دیں گے لیکن بزدلی کا یہ عالم ہو گا کہ ایک چھپکلی دیکھ کر ان پر لرزہ طاری ہو جائے گا۔ ثالثاً شاعروں کے کلام میں ہر طرح کے لوگوں کو اپنے مطلب کے مضامین مل جاتے ہیں اور وہ ان کے مداح بن جاتے ہیں۔ ان میں جہاں کچھ اچھے لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں وہیں گمراہ، شرپسند اور اوباش لوگ بھی ان کے نام کا جھنڈا اٹھا لیتے ہیں۔

شاعری کی ان خصوصیات اور شاعروں کے اس کردار کے برعکس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر جو کلام نازل ہو رہا تھا اس کا ایک متعین ہدف تھا جس سے کہیں انحراف نظر نہیں آتا تھا۔ جو بات انھوں نے پہلے دن کہی ساری عمر مختلف اسالیب میں اسی کی وضاحت کرتے رہے۔ اس سے سرمو ہٹنے کی کبھی نوبت نہیں آئی۔ حقیقت میں یہی چیز قریش کے لیے باعث تشویش بھی تھی۔ مثلاً اگر توحید کا مضمون اتفاقی طور پر کبھی کبھی سامنے آیا ہوتا تو وہ اس کو برداشت کرتے رہتے۔ اس مضمون کی تکرار ہی اصل میں ان کے نظام پر ضرب لگاتی تھی اور یہ بات ان کے لیے سوہان روح تھی۔ پھر آپ جو کچھ پیش کر رہے تھے نہ صرف اس پر خود عمل کر رہے تھے بلکہ اپنے تمام ساتھیوں کے اندر بھی اسی عمل کی نمود چاہتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ کی تربیت سے معاشرے کے بہترین افراد کی ایک بڑی جماعت تیار ہو رہی تھی جن کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا۔ وہ جس بات کو درست تسلیم کر رہے تھے اس کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ بھی رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کو دیکھ کر دوسرے لوگ بھی اسی چشمہ سے سیراب ہونے کے خواہشمند ہوتے جس سے ان فرشتہ سیرت لوگوں

خیال کیا جاتا تھا۔ پانی سے آزاد محض ڈھیلوں سے استنجا مردانہ فعل سمجھا جاتا تھا اور اس مقصد کے لیے پانی کا استعمال گویا زنانہ عادت تصور کی جاتی تھی۔

میرے نزدیک قرآن اور حدیث دونوں سے ثابت ہے کہ صفائی کے مقصد سے پانی افضل ہے اس لیے کہ دین اسلام کی حیثیت عالمی ہے۔ لیکن رخصت کا راستہ بھی کھلا رہنا چاہیے۔ اس لیے ڈھیلوں پر نہ تو اعتراض کرنا چاہیے اور نہ کوئی پھبتی چست کرنی چاہیے۔ استنجا کے لیے ڈھیلے طاق تعداد میں لینے کا حکم ہے یعنی تین یا پانچ یا سات۔ ایک ڈھیلا کافی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فلیوتر (وہ طاق کرے) میں یہ بات مضمر ہے کہ پہلے کوئی جفت ہو جس کو طاق کیا جائے۔ مثلاً دو پر ایک کے اضافے سے تین یا چار پر ایک کے اضافہ سے پانچ کرنا۔

انسانی فطرت میں یہ بات کچھ گتی ہوئی معلوم ہوتی ہے کہ ایک کام کیا جائے، دوسری مرتبہ کرنے سے اس میں بہتری پیدا کی جائے اور تیسری بار کرنے سے اس میں حسن وخوبی پیدا کی جائے اور اطمینان حاصل کیا جائے۔ اس کا لحاظ عبادات میں بھی ہے۔ مثلاً تسبیحات تین ادا کرتے ہیں۔ اعضائے وضو بھی تین مرتبہ دھوئے جاتے ہیں۔

پاکیزگی کے حصول کے نقطہ نظر سے استنجا ایسے پتھر، کنکری، ڈھیلے سے یا ایسی چیز سے کرنا چاہیے جس میں رطوبت فاسدہ جذب ہو سکے۔ چکنے پتھر اس کام کے لیے موزوں نہیں ہیں۔ اگر وہی میسر ہوں تو ان کی تعداد کو مزید بڑھایا جاسکتا ہے۔ کپڑا اور ٹائلٹ پیپر بھی ڈھیلے کے قائم مقام کے طور پر ٹھیک ہیں، اس لیے کہ ان میں رطوبت جذب کرنے کی خوبی موجود ہے۔

۴۔ وَحَدَّثَنِي عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ أَنَّ عَبْدَالرَّحْمَانِ بْنِ أَبِي بَكْرٍ قَدْ دَخَلَ عَلَى عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ يَوْمَ مَاتَ سَعْدُ بْنُ أَبِي وَقَّاصٍ فَدَعَا بِوَضُوءٍ. فَقَالَتْ لَهُ عَائِشَةُ: يَا عَبْدَالرَّحْمَانِ! أَسْبِغِ الْوُضُوءَ. فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُولُ: وَيْلٌ لِلْأَعْقَابِ مِنَ النَّارِ.

ترجمہ: امام مالک کو یہ بات پہنچی کہ حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس اس دن گئے جس دن سعد بن ابی وقاصؓ کی وفات ہوئی۔ انہوں نے وضو کے لیے پانی منگوایا تو حضرت عائشہؓ نے ان سے فرمایا: اے عبدالرحمن اچھے طریقے سے وضو کیجیو اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ ہلاکی ہو ایڑیوں کے لیے، دوزخ کی آگ سے!

وضاحت:

أَسْبِغِ الْوُضُوءَ: اسباغ سے مراد ہے اچھے طریقہ اور پوری احتیاط کے ساتھ کسی کام کو انجام دینا۔ اسباغ

خالد مسعود

رسول اللہؐ کی مخالفت میں قریش کی منصوبہ بندی

بنو ہاشم کو حضرت محمد ﷺ کی حمایت سے دستبردار کرنے میں جب قریش کو کوئی کامیابی نہ ہوئی، ابوطالب بحیثیت سربراہ خاندان حضور کی پشت پناہی پر مصر رہے اور ان کے بھائیوں نے اگرچہ اسلام قبول نہیں کیا لیکن اپنے بھتیجے کو برابر تحفظ فراہم کرتے رہے اسی طرح جو نوجوان حضورؐ کے ساتھ تھے وہ ظلم و تشدد سہنے کے باوجود اپنے موقف پر قائم اور اختیار کردہ دین پر ثابت قدم رہے، تو انہوں نے پیش آمدہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے دوسرے طریقوں پر غور شروع کیا۔ صورت حال یہ تھی کہ روز بروز مسلمان قوی تر ہوتے جارہے تھے۔ ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہورہا تھا۔ مکہ کے بہت سے گھروں میں یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ آبائی مذہب کو خیرباد کہہ کر کہیں کوئی باپ، کہیں بیٹا یا بھائی، کہیں شوہر اور کہیں بیوی، اسلام کی تعلیم کو قبول کرکے رسول اللہؐ کے ساتھی بن گئے اور ہر گھرانے میں ایک ایسی بحث چل نکلی جس سے پیچھا چھڑانا کسی کے لیے ممکن نہ رہا۔

اس صورت حال سے نکلنے کا ایک طریقہ تو یہ تھا کہ قریش اپنے منصب کے اصل تقاضوں، اپنے طرز عمل اور کمزوریوں کا جائزہ لے کر اصلاح پر آمادہ ہو جاتے، ان کی نگاہ مکہ کے ابراہیمی مرکز توحید کی ذمہ داریاں ادا کرنے میں اپنی کوتاہیوں کی طرف اٹھتی، اور وہ اپنے غیر فطری اور غیر اخلاقی نظام میں تبدیلی لاتے جو ان کے معاشرہ میں عوام الناس کے لیے مشکلات کا باعث بنا ہوا تھا۔ لیکن یہ طریقہ قریش کے متکبرانہ رویہ سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس سے ان کی انا مجروح ہوتی اور مفادات پر ضرب پڑتی تھی۔ اس لیے انہوں نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا۔ دوسرا طریقہ، جس سے وہ صورت حال کا مقابلہ کر سکتے تھے، یہ تھا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے پیغام کی مخالفت کی راہیں تلاش کرتے۔ بدقسمتی سے انہوں نے اسی راستہ کا انتخاب کیا۔ حالات کا تجزیہ کرنے پر وہ اس نتیجہ تک پہنچے کہ لوگ دو اسباب کی بنا پر نئے دین کو اختیار کررہے ہیں۔ ایک یہ کہ محمد (ﷺ) کے کلام میں غیر معمولی تاثیر ہے۔ جو نوجوان اس کو سن لیتا ہے وہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ جب کلام بار بار کسی کو سنایا جاتا ہے تو وہ اس کا اتنا شیدائی ہو جاتا ہے کہ نہ کسی سختی کو خاطر میں لاتا اور نہ کسی ترغیب وتحریص کا اثر قبول کرتا ہے۔ چونکہ محمد اس کو وحی الٰہی قرار دیتے ہیں تو یہ چیز عوام کو مرعوب کردیتی ہے۔ دوسرا یہ کہ لوگ محمد کے اس دعوئی سے متاثر ہوگئے ہیں کہ وہ خدا کا نمائندہ

بالسّاق. الیٰ ربّک یومئذ المساق۔ (قیامہ: ۲۶۔۳۰)

یہاں تمام آیات۔اق پر ختم ہورہی ہیں۔

ان آیات میں قافیہ بندی دیکھنے تو شعروں کا گمان ہوتا ہے، لیکن شعر میں جو وزن ہوتا ہے وہ ان میں نہیں ہے، لہٰذا یہ نثری کلام ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے، لیکن قافیہ کے ساتھ، اگر مماثلت رکھتے ہیں تو وہ کاہنوں کے کلام میں پائی جانے والی سجع سے ہے، لیکن یہاں کلام بامقصد، پرحکمت اور ایک واضح پیغام کا حامل ہے، جبکہ کاہنوں کا کلام تک بندی کی نوعیت کا ہوتا جس کا مدعا سمجھنا بھی مشکل ہوتا۔ ان آیات میں مستقبل کا تذکرہ دوٹوک انداز میں ہے جو ایک ان دیکھی حقیقت سے پردہ اٹھا رہا ہے۔ اس کے برعکس کاہنوں کی خبریں ذومعانی اور غیر یقینی ہوتیں۔ جہاں تک فصاحت و بلاغت کا تعلق ہے وہ اس کلام میں بدرجہ اتم موجود ہے لیکن یہ اس فصاحت سے کہیں زیادہ بلند و برتر ہے جو انسانوں کے یا خود نبی ﷺ کے ذاتی کلام میں پائی جاتی ہے۔ اس کلام میں اس طرح کے بے معنی الفاظ بھی نہیں ہیں جو جادو کے منتروں میں ہوتے ہیں۔ ہر بات پرمغز، حقیقت افروز اور دل کو بھانے والی ہے۔ پورا قرآن اسی طرح کے فصیح و بلیغ کلام پر مشتمل ہے۔ اس کی خصوصیات کو دیکھتے ہوئے اس کو تنقید کا نشانہ بنانا اور اس کے مخالف جذبات ابھارنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں۔ تاہم قریش نے پروپگنڈا کی خاطر قرآن کو ہدف بنانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اس کو کبھی شاعری، کبھی کہانت، کبھی انسانی کاوش اور کبھی جادو کہہ کر اس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے۔

عرب بالعموم کلام کے حسن و قبح کو پہچاننے والے اور اس کے زبردست نقاد تھے، اس لیے قرآن کو شاعری قرار دینا اپنی نادانی کا ثبوت پیش کرنا تھا۔ لیکن ایک پہلو ایسا تھا جس کی رو سے قریش یہ غلط بات کر کے بھی اپنی بات کی لاج رکھ سکتے تھے۔ عربوں کا عقیدہ یہ تھا کہ ہر شاعر کسی جن کے زیر اثر اپنا کلام پیش کرتا ہے۔ رسول اللہؐ چونکہ بتاتے تھے کہ میرے اوپر فرشتہ وحی کلام نازل کرتا ہے، قریش اس کو آپ کی غلط فہمی قرار دیتے کہ آپ جس کو فرشتہ سمجھتے ہیں وہ حقیقت میں جن ہے جو شاعروں پر کلام کا الہام کرتا ہے۔

عربوں میں کاہنوں کی بڑی قدر تھی جو غیب دانی کے دعویدار تھے۔ لوگ کسی معاملہ میں مشورہ لینے کے لیے ان سے رجوع کرتے تو کاہن مراقبہ کر کے جنات و شیاطین کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کا ڈھونگ رچاتے۔ پھر وہ کچھ ایسا کلام سناتے جس کے فقرے مختصر اور قافیہ کے ساتھ ہوتے۔ اس مقفّیٰ و مسجع عبارت کے متعلق ان کا دعویٰ یہ ہوتا کہ ان کو اس کا الہام ہوا ہے۔ اس عبارت سے ایک سے زیادہ معانی نکالنا ممکن ہوتا۔ اس میں مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کا عنصر بھی شامل ہوتا۔ قریش جب قرآن کو کہانت سے تعبیر کرتے تو ان کے پیش نظر ابتدائی سورتوں کے مختصر جملے، آیات میں قافیہ اور سجع کا اہتمام اور

تھی۔ قریش کا یہ اعتراض بھی بے جان تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن انتہائی معیاری عربی میں ہے۔ ایسا کلام تخلیق کرنا کسی عجمی کے بس کی بات ہے اور نہ پیغمبر ﷺ کا ذاتی کلام اس نوعیت کا ہے۔ قرآن اگر انسانی تصنیف ہوتا تو قریش کے پاس نہ بہترین شاعروں کی کمی تھی نہ اعلیٰ خطیبوں کی۔ ایسے بیسیوں افراد مہیا کرنا کچھ مشکل نہ تھا جو قرآن جیسا کلام تخلیق کر لیتے۔ قرآن کے مشابہ کلام وضع کرنا ممکن نہ تھا اسی لیے جب قریش کو ایک ہی پرحکمت سورہ بنا کر پیش کرنے کی دعوت دی گئی تو آخر انہوں نے اس چیلنج کا مقابلہ کیوں نہ کیا۔ باقی رہا یہ سوال کہ قرآن یکبارگی کیوں نہ اتارا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی بھی سنجیدہ اور پرحکمت چیز فی الفور ذہنوں میں اتاری نہیں جا سکتی، اگر اس کی تعلیم دینا اور تفہیم کرنا مطلوب ہو۔ ایک ناول تو ایک ہی نشست میں پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے لیکن سائنس یا فلسفہ کی کوئی کتاب اس طرح پڑھنا اور سمجھ لینا ممکن نہیں ہوتا۔ قرآن کے نزول میں معاملہ اللہ کی قدرت کا نہیں بلکہ انسانوں کے تحمل کی صلاحیت کا ہے۔

سحر:

قرآن کی دعوت جس طرح لوگوں کو فتح کر رہی تھی اس سے یہ بات واضح تھی کہ یہ کلام جہاں فصیح و بلیغ ہونے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا وہیں نہایت زود اثر بھی ہے۔ جب کوئی شخص اس کو سن لیتا ہے تو وہ نہ صرف اس کلام سے مسحور ہو جاتا ہے بلکہ اس کی خاطر خاندان اور قبیلے کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اس بنا پر قریشی سردار قرآن کو جادو سے تعبیر کرتے۔ یہ معاملہ قرآن ہی کے ساتھ پیش نہیں آیا، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو پیغام پیش کیا اس کو بھی مخالفین سحر قرار دیتے۔ قریش کا یہ موقف بھی نادرست تھا۔ کلام وحی اور سحر میں کوئی چیز مشترک نہیں۔ ساحروں کے شعبدوں کی چمک دمک عارضی ہوتی ہے، وہ کبھی پائیدار کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔ سحر کے اثرات وقتی اور بہت جلد زائل ہونے والے ہوتے ہیں جبکہ قرآن نے لوگوں کے قلوب و اذہان کو بدل کر رکھ دیا۔ سحر باطل ہوتا اور حق کے مقابلہ میں آ کر بودا ثابت ہوتا ہے جبکہ قرآن سراپا حق ہے اور جب یہ حق باطل کے ساتھ ٹکرایا تو اس کو سرنگوں کر دیا۔ قریش دیکھ رہے تھے کہ قرآن کے حق کی ان کے باطل کے ساتھ پنجہ آزمائی کامیابی سے ہمکنار ہو رہی ہے اور ہر آنے والا دن باطل کو پسپا ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔ جادو کے اثر سے کردار کی تعمیر ممکن نہیں ہوتی جبکہ قرآن نہایت اعلیٰ کردار کے افراد تیار کر رہا تھا۔ لہٰذا قریش کا پروپگنڈا سادہ لوح عوام کو مطمئن کرتا رہا ہو گا یا ان کے خوشامدی اس سے ان کے ہمنوا ہو گئے ہوں گے لیکن عاقل و فرزانہ اس سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے۔

قرآن کی حیثیت:

قریش کے پروپگنڈے کا جواب مختلف پیرایوں میں خود قرآن میں دیا گیا اور ان کو ذہنی خلجان

ہے اور اس کی طرف سے اس کو جو پیغامات ملتے ہیں ان کے پہنچانے پر وہ اللہ کی طرف سے مامور ہے۔ ان دونوں باتوں کا توڑ ان کو اس میں نظر آیا کہ ایک طرف محمد ﷺ کے پیش کردہ کلام کو ساقط الاعتبار ٹھہرائیں تاکہ لوگ اس کو اللہ کی جانب سے نازل شدہ کلام کی حیثیت نہ دیں بلکہ ایک انسانی کاوش کے درجہ میں رکھیں۔ دوسری طرف ان کے اس دعویٰ کو جھٹلایا جائے کہ وہ خدا کے منتخب رسول ہیں تاکہ لوگ ان کو اپنے جیسا انسان ہی سمجھیں اور ان کے نبی ہونے کے دعویٰ سے مرعوب نہ ہوں۔ ان دونوں حوالوں سے قریش کے موقف کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

قرآن پر اعتراضات

شاعری اور کہانت:

قرآن مجید نازل ہونا شروع ہوا تو ابتدائی سورتوں میں، جو مصحف کے آخری حصہ میں شامل ہیں، آیات نہایت گٹھے ہوئے، مختصر، لیکن جامع جملوں کی شکل میں تھیں۔ یہ کلام بے حد فصیح و بلیغ، اعجاز بیان کا کامل نمونہ، پرمعانی اور پرشکوہ ہے۔ اس میں جلالت شان ہے۔ علاوہ ازیں اس میں قافیہ بندی پائی جاتی ہے۔ ان سورتوں میں اس دنیا کے خاتمہ، اس کے بعد پیش آنے والے واقعات، آخرت میں انسان کے محاسبہ اور جزا و سزا کا بکثرت ذکر ہے۔ ان تمام باتوں کا تعلق مستقبل یا ایک دوسرے جہان سے ہے۔ اس کلام کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

- كَلَّا وَالْقَمَرِ. وَاللَّيْلِ اِذْ اَدْبَرَ. وَالصُّبْحِ اِذَا اَسْفَرَ. اِنَّهَا لَاِحْدَى الْكُبَرِ. نَذِيْرًا لِّلْبَشَرِ. لِمَنْ شَاءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّتَقَدَّمَ اَوْ يَتَاَخَّرَ. (مدثر: ۳۲۔۳۷)

  ان آیات کے قافیہ میں ر کی تکرار دیکھیے۔
- اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ. وَ اِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ. وَ اِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ. وَ اِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ. عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ۔ (انفطار: ۱۔۵)

  ان آیات میں تقریباً برابر جملوں کا اختتام قافیہ ت پر ہو رہا ہے۔
- اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا. اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا. وَاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا. (معارج: ۱۹۔۲۱)

  یہاں جملے برابر طوالت کے ہیں اور ان کا اختتام 'وعًا' پر ہوا ہے۔
- كَلَّا اِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ وَ قِيْلَ مَنْ رَاقٍ. وَ ظَنَّ اَنَّهُ الْفِرَاقُ. وَالْتَفَّتِ السَّاقُ

نے فیض پایا تھا۔ چونکہ حضور کے ہاں اصل قدر و قیمت عمل صحیح کی تھی اس لیے کوئی آوارہ اور فضول شخص آپ کے ساتھیوں میں شامل ہو ہی نہ سکتا تھا۔ قرآن نے قریش کو بار بار توجہ دلائی کہ سوچو، پیغمبر کے ساتھی آخر معاشرے کے صالح اور خدا ترس افراد کیوں بن رہے ہیں؟ آوارہ منش لوگوں کو یہ کلام کیوں اپیل نہیں کر رہا ہے؟ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پیغمبر اعلیٰ اقدار کو معاشرہ میں رواج دے رہے ہیں۔ وہ رب کی بندگی، بندوں کے لیے ایثار اور غریبوں کے لیے مواسات اور رحم دلی کا ہدف اگر دوسروں کے سامنے رکھتے ہیں تو سب سے آگے بڑھ کر اس ہدف کو خود حاصل کرنے کی جدوجہد بھی کر رہے ہیں، اور اسی کو دلائل سے بھی ثابت کر رہے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو اچھے اور نیک طینت لوگوں کو اپیل کر رہی ہے۔ اگر پیغمبر ایک شاعر ہوتے تو دوسرے شاعروں سے مختلف نہ ہوتے۔

قریش کا قرآن کو کہانت کہنا بھی ایک دور کی کوڑی لانے کے مترادف تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن جیسا پاکیزہ، بامقصد، خدا ترسی اور خدمت خلق کی دعوت دینے والا کلام شیاطین کی بری فطرت کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ شیاطین کے مقاصد کے ساتھ مطابقت رکھنے والا وہی کلام ہو سکتا ہے جو شیطانی مقاصد پورا کرنے کے لیے موزوں ہو۔ پاکیزہ کلام اتار کر اور نیکی کا چرچا کر کے وہ اپنے ہی پاؤں پر کیوں کلہاڑی ماریں گے۔ پھر کلام اللہ کاہنوں کے کلام سے مختلف بھی ہے۔ اس جیسا فصیح و بلیغ کلام کہنا کاہنوں اور ان کے شیطانوں کے بس کی بات نہیں۔ شیطان اپنی باتوں کا القا کسی نیک سرشت والے آدمی پر نہیں کرتے۔ باطل کو پسند کرنے والے جھوٹے لوگ ان سے متاثر ہوتے ہیں جو مکر و فریب کے ذریعے لوگوں کو بے وقوف بنا کر کہانت کی دکان چمکاتے ہیں۔ یہ لوگ اخلاقی اعتبار سے بے حد پست ہوتے ہیں۔ جہاں تک کاہنوں کی دی ہوئی خبروں کا تعلق ہے ان میں سچ اور جھوٹ کی آمیزش ہوتی ہے کیونکہ جنات و شیاطین کو بارگاہ الٰہی کے معاملات تک رسائی حاصل نہیں ہے۔ ان کے پاس خرافات کا ذخیرہ ہوتا ہے۔ ان کا القا جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ اس کے برعکس پیغمبر روح القدس سے فیض پاتا اور صداقت و امانت میں اپنا مثیل نہیں رکھتا ہے۔

انسانی کاوش:

قرآن اپنے پیغام کو جب دلائل سے ثابت کرتا اور لوگ اس سے متاثر ہو کر یہ سوچتے کہ اس قسم کا پر مغز کلام اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کے بغیر کوئی شخص کیسے پیش کر سکتا ہے اور وہ لیڈروں کے پاس آ کر اپنا وسوسہ بتاتے تو لیڈر ان کو قائل کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ کلام محمد (ﷺ) ہی کے ذہن کی پیداوار ہے البتہ وہ تنہا یہ کام نہیں کر رہا ہے۔ بلکہ بعض عجمی لوگ اور کچھ اہل کتاب اس کے ساتھی بن گئے ہیں اور وہ سب مل کر یہ کلام گھڑتے ہیں اور جتنا بنا چکتے ہیں اتنا محمد آ کر پیش کر دیتے ہیں اور اس کا اعتبار قائم کرنے کے لیے اس کو منسوب خدا کی طرف کر دیتے ہیں۔ اگر یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس کو تو سوچ سوچ کر اتارنے کی ضرورت نہ

سے نکالنے کے لیے اس کلام کی حیثیت بار بار واضح کی گئی جس کو نبی ﷺ پیش کر رہے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ حق پسند طبیعتیں قومی تعصب سے نکلیں اور رسول اللہ کی دعوت کے لیے اپنے کان کھولیں۔ مختلف سورتوں میں کلام کے منبع، اس کو لانے والے فرشتہ کی صفات و خصوصیات اور اس کو وصول کرنے اور لوگوں تک پہنچانے والے رسول، سب کے بارے میں روشنی ڈالی گئی۔ چند آیات ملاحظہ ہوں:

- ''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جن کو تم دیکھتے ہو، اور ان چیزوں کی بھی جن کو تم نہیں دیکھتے کہ بے شک یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے، اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں۔ تم بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ اور یہ کسی کاہن کا بھی کلام نہیں۔ تم بہت ہی کم سمجھتے ہو۔ یہ خداوند عالم کی طرف سے اتارا ہوا ہے''۔ (الحاقہ: ۳۸۔۴۳)
- ''پس نہیں، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے، چلنے والے اور چھپ جانے والے (ستاروں) کی، اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے، اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے، کہ لاریب یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے۔ وہ بڑا ہی قوت والا اور عرش والے کے نزدیک بڑا ہی بارسوخ ہے۔ اس کی بات مانی جاتی اور وہ نہایت امین بھی ہے۔ اور تمہارا یہ ساتھی (نبی ﷺ) کوئی خبطی نہیں ہے۔ اور اس نے اس کو کھلے افق میں دیکھا ہے۔ اور یہ غیب کی باتوں کا کوئی حریص نہیں ہے۔ اور یہ کسی شیطان رجیم کا القاء نہیں ہے۔ تو تم کہاں کھوئے جاتے ہو؟'' (التکویر: ۱۵۔۲۶)
- ''اور بے شک یہ نہایت اہتمام سے خداوند عالم کا اتارا ہوا ہے۔ اس کو تمہارے قلب پر امانت دار فرشتہ لے کر اترا ہے تاکہ تم لوگوں کو آگاہ کر دینے والوں میں سے بنو۔ واضح عربی زبان میں۔ اور اس کا ذکر اگلوں کے صحیفوں میں بھی ہے۔ کیا ان لوگوں کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو علمائے بنی اسرائیل جانتے ہیں''۔ (الشعراء: ۱۹۲۔۱۹۷)

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ جہانوں کے مالک نے اپنے منصوبہ کے تحت اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے نہایت اہتمام سے اپنا کلام اتارا۔ اس کے نازل کرنے کے لیے جس فرشتہ کا انتخاب کیا وہ نہایت قوی اور مضبوط، عقل اور کردار میں محکم اور امانت دار ہے۔ ذمہ داری ادا کرنے میں وہ خیانت کا مرتکب نہیں ہوتا۔ وہ اعلیٰ صلاحیتوں سے مالا مال ہے۔ کوئی دوسرا اس کو متاثر یا مرعوب نہیں کر سکتا۔ وہ کسی سے دھوکا کھاتا اور نہ کسی کے ہاتھ بک سکتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے کلام میں کسی باطل کی آمیزش خارج از

امکان ہے۔ اس مقرب فرشتہ نے نبی کو نہایت اہتمام، توجہ اور شفقت سے اس وحی کی تعلیم دی جو اللہ نے اس پر نازل کرنی چاہی۔ نبی کو ذاتی طور پر غیب دانی کا چسکا نہیں ہے۔ وحی الٰہی کی ذمہ داری تو بے سان و گمان اس پر آ پڑی ہے اور وہ اس کو نبھا رہا ہے۔ یہ نبی کے ذہن کی پیداوار نہیں ہے۔ وحی کی زبان نہایت معیاری اور واضح عربی ہے جس کی کوئی نظیر موجود نہیں۔ اس کی تعلیم میں کوئی کج پیچ نہیں۔ اس کی رہنمائی بالکل فطری، عقلی اور سیدھی راہ کی طرف ہے جس کے دلائل عقل و فطرت، کائنات، اور انسانی نفسیات میں موجود ہیں۔ ان حقائق کے باوجود بھی قریش اگر اس کلام کی مخالفت کرتے ہیں تو یہ ان کے تعصب، تکبر اور ذاتی مفادات کے باعث ہے۔

زائرین مکہ کے لیے قریش کا یکساں موقف:

مکہ تمام قبائل عرب کا دینی مرکز تھا اور عرب حج اور عمرہ کی عبادات سے شغف رکھتے تھے اس لیے مکہ میں ان کی آمد و رفت بکثرت ہوتی۔ قریش کو یہ پریشانی لاحق ہوئی کہ باہر سے آنے والے لوگ مکہ آ کر جب ایک پیغمبر کی بعثت کی خبر سنیں گے تو قدرتی طور پر ان کو اس کے بارے میں جاننے کی خواہش ہو گی۔ وہ مسلمانوں سے ملیں گے تو دعوت قبائل عرب میں بھی پھیل سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تدارک کے لیے اقدام کی ضرورت ہے۔ ولید بن مغیرہ کو، جو قریش کا ایک عمر رسیدہ اور زیرک سردار تھا، اس ضرورت کا احساس ہوا تو اس نے دوسرے سرداروں کے سامنے تجویز پیش کی کہ باہر کے لوگوں کے سامنے محمد کے بارے میں الگ الگ رائے ظاہر کر کے ان میں اس سے بالمشافہ ملاقات کا اشتیاق پیدا کرنے کے بجائے ہمیں متفق الرائے ہو کر ایک ہی بات بتانی چاہیے۔ طے ہوا کہ سب لوگ ایک ممکن دموزوں جواب سوچ کر آئیں تاکہ تمام آراء پر غور کر کے کسی ایک بات پر اتفاق کر لیا جائے۔ جب مجلس منعقد ہوئی تو ولید نے آرا طلب کیں۔ کچھ لوگوں نے کہا ہم محمد کے کلام کو کہانت کہیں گے۔ ولید نے کہا ہم نے کاہن دیکھ رکھے ہیں اور ان کا کلام بھی سن رکھا ہے۔ اللہ کی قسم، محمد کا کلام نہ تو کاہنوں کے خفیہ کلام کی طرح ہے نہ اس کی مماثلت ان کی قافیہ بندی سے ہے۔ کچھ لوگوں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ محمد کو جنون لاحق ہو گیا ہے۔ ولید نے کہا ہم جنونیوں کو پہچانتے ہیں۔ ان کے دماغوں میں خلجان ہوتا اور وسوسے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ چیز محمد میں نہیں پائی جاتی۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ ہمیں چاہیے کہ محمد کو بطور شاعر پیش کر دیں۔ ولید نے کہا کہ شاعری کی تمام اقسام اور ان کی خصوصیات سے ہم آگاہ ہیں، شعر کی پرکھ کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں جب شاعری کی یہ خصوصیات مفقود ہیں تو ہمارا یہ موقف کون مانے گا۔ لوگوں نے کہا پھر محمد کو ساحر کہہ دینا چاہیے۔ ولید نے کہا، ہم نے ساحروں کو دیکھا ہے۔ وہ منتر پڑھتے، پھونکیں مارتے اور

گر ہیں لگاتے ہیں۔ محمد ایسا نہیں کرتے۔ اس پر لوگوں نے کہا، اے ابو عبد شمس! پھر آپ ہی ہمیں کوئی رائے دیں، ہم اسی پر قائم رہیں گے۔ اس نے جواب دیا، اللہ کی قسم! محمد کے پیش کردہ کلام میں شیرینی ہے۔ یہ پاتال میں اترا ہوا ایک ایسا درخت ہے جس کی شاخیں ثمر آور ہیں۔ ان تمام باتوں میں سے جو کچھ بھی تم کہو گے وہ صاف جھوٹ مانا جائے گا۔ البتہ اگر محمد کو ساحر کہو تو اس کا ایک محل ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ محمد کا کلام جادو کا سا اثر رکھتا ہے۔ جس طرح جادو کے عمل سے محبت و الفت یا نفرت و عداوت کے جذبات پیدا کیے جاتے ہیں اسی طرح اس کلام سے آدمی اور اس کے باپ، بیٹے یا بھائی کے درمیان، اور شوہر اور بیوی کے درمیان، اور آدمی اور اس کے قبیلہ کے درمیان تفریق پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ طے ہوا کہ مکہ آنے والوں میں سے اگر کوئی شخص محمد کے بارے میں رائے طلب کرے تو سب اس کو جادو کہیں اور کلام کے اس نتیجہ سے ڈرائیں۔ ولید کی اس تجویز پر قریش نے عمل کیا لیکن پھر بھی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

کتب سیرت میں بیان ہوا ہے کہ قبیلہ دوس کے ایک سردار طفیل بن عمرو ایک باصلاحیت آدمی تھے۔ وہ عمرہ کے لیے مکہ گئے تو وہاں سنا کہ ایک شخص نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا ہے اور لوگ اس کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔ انہوں نے قریش میں اپنی جان پہچان والوں سے دریافت کیا تو ہر ایک نے ان کو حضور سے متنفر کیا اور آپ کے سایہ سے بھی بچ کر رہنے کی تلقین کی۔ قریش نے ان کو بتایا کہ اس شخص کے پاس ایک ایسا جادو ہے جو میاں اور بیوی کے درمیان تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ طفیل کچھ روز تک حضور کا سامنا کرنے سے کتراتے رہے۔ پھر سوچا کہ میں ایک عاقل، جہاں دیدہ اور نیک و بد میں تمیز کی صلاحیت رکھنے والا آدمی ہوں۔ خود شاعر ہوں اور شاعرانہ کلام کی پرکھ کر سکتا ہوں۔ آخر ایک آدمی مجھے کیسے ورغلا سکتا ہے جب کہ میں اس کی طرف سے محتاط بھی ہوں۔ یہ سوچ کر طفیل نے مسجد حرام میں نبی ﷺ کی آمد و رفت پر نظر رکھی۔ جب آپ عبادت سے فارغ ہو کر گھر جانے لگے تو وہ آپ کے پیچھے ہو لیے۔ حضور کے گھر پہنچ کر ملاقات کی خواہش کی۔ آپ نے اجازت دی تو انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ میں نے سنا ہے کہ آپ کوئی جادو اثر کلام سناتے ہیں۔ پہلے تو میں اجتناب کرتا رہا تاکہ آپ کا کلام میرے کانوں میں پڑ کر مجھے گمراہ کرنے کا باعث نہ بن جائے لیکن اب میں نے سوچا کہ اس کو سننا تو چاہیے۔ اس لیے حاضر ہوا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو قرآن سنایا تو طفیل اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی وقت مسلمان ہو گئے۔ جب اپنے قبیلہ میں لوٹے تو اپنے والد اور بیوی کو بھی مسلمان کر لیا۔ بعد میں ان کی دعوت سے قبیلہ دوس کے مزید کئی افراد مسلمان ہوئے۔

(جاری ہے)

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

کیا سیکولر ریاستوں سے ہجرت کر جانا مناسب ہے؟

سوال: آپ نے اپنی کتاب تزکیۂ نفس میں حکومت کی ایک قسم یہ بیان کی ہے کہ وہ غیر مسلم ہو، اس کا قانون غیر اسلامی ہو لیکن پرسنل لاء کی حد تک اقلیت کے حقوق محفوظ ہوں اور اسلام کی دعوت سے متاثر ہو کر کوئی شخص اس کو قبول کر لے تو اس کو ظلم و ستم کا نشانہ نہ بنایا جاتا ہو۔ آپ کی رائے میں اس حکومت کے سیکولر ہونے کے سبب سے مسلمانوں کو یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہاں سے ہجرت کر جائیں کیونکہ یہ حکومت ذاتی عقیدہ اور مذہب میں دخل انداز نہیں ہے۔

اس مضمون پر چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ سورہ نساء کی آیت ۹۷ کی رو سے ایک مسلم حکومت کے ہوتے ہوئے دارالکفر میں مسلمانوں کا رہنا ناجائز ہے، ان کو وہاں سے ہجرت کر جانا چاہیے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا دارالکفر میں رہنے کا جواز اگر کچھ پیدا ہوتا ہے تو صرف انہیں لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو وہاں کے باشندے ہیں۔ وہ بے شمار لوگ کس ضمن میں آئیں گے جو مسلمان ملکوں سے دارالکفر میں جا کر آباد ہو جاتے ہیں۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ جو لوگ غیر مسلم ریاستوں میں قیام رکھتے ہیں، کیا ان کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کسی مسلم ملک میں چلے جائیں جہاں وہ دین و ایمان کی بہتر حفاظت کر سکتے ہوں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس تجویز پر ایک مثالی دارالاسلام قائم ہونے پر ہی عمل ہو سکتا ہے لیکن مذکورہ آیت کا منشاء دارالکفر چھوڑنا ہے نہ کہ دارالاسلام میں ہجرت کر جانا۔

جواب: اس سوال کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت چونکہ ایک بہت بڑی عبادت ہے اس لیے جب بھی کر لی جائے نیکی کا کام ہے۔ لیکن خوب سمجھ لیجیے کہ ہجرت کا تعلق وقت اور حالات سے ہے اور یہ دین کی حفاظت کے لیے ہوتی ہے۔ ہجرت میں پہلی شرط ہی یہ ہے کہ آپ کو آپ کے دین کی بنیاد پر ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہو تب آپ کو یہ سوچنا پڑے گا کہ اب میں اپنے دین کو بچانے کے لیے کہاں جاؤں۔ لیکن اس سے پہلے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر اہل ایمان ہر دارالکفر سے نکل جائیں تو وہاں تبلیغ کے لیے کون رہ جائے گا۔ دین کی مصلحت یہ ہے کہ جن ملکوں میں آپ رہتے ہیں ان میں دین کو لوگوں کے کانوں تک پہنچاتے ہیں۔ اگر اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور وہاں اگر کوئی آپ کی دعوت قبول کرتا ہے اور اس کو ظلم و ستم کا نشانہ نہیں بنایا جاتا تو وہاں کا رہنا دین کی مصلحت کے عین مطابق ہے۔ اگر مسلمان

ایسے دارالکفر سے ہجرت کرتے جائیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سرزمین آپ نے غیر مسلموں کے حوالے کردی۔ اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلمان ملکوں میں بھی کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کو آپ صحیح معنوں میں دارالاسلام کہیں تو اپنے ملک سے ہجرت کر کے آپ کہاں جائیں گے۔

سورہ نساء کی مذکورہ آیت کا اصل پس منظر یہ ہے کہ مکہ اور دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کو شدید مظالم کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔ مدینہ والوں نے اپنا دروازہ مہاجرین کے لیے کھول دیا تھا کہ بھائیو آؤ، ہم تمہیں پناہ دیتے ہیں۔ اس وقت ہجرت واجب ہوچکی تھی۔ اس صورت حال میں جو لوگ دارالکفر میں رہ جاتے ہیں وہ نفاق کے ساتھی ہیں اور کفر میں کچھ مصلحتیں رکھتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہجرت نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کا دین بھی معتبر نہیں ہوتا۔

اس زمانہ میں جو لوگ اپنے کاروبار یا روزگار کے لیے یورپ اور امریکہ میں ہیں وہ ہجرت کا کوئی معاملہ نہیں ہے، وہ تو کاروبار ہے۔ اگر وہ اپنے دین سے بے پرواہیں تو اپنی عاقبت کی خیر منائیں اور اگر وہ اپنے دین کا تحفظ کرتے ہوئے کاروبار کر سکتے ہیں تو اس میں ہم آپ کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ لیکن مجرد روزگار یا کاروبار کے لیے وہاں جانا، درآنحالیکہ اپنے دین وایمان کو وہاں خطرہ ہو، تو واقعہ یہ ہے کہ یہ تو بالکل ہی اپنے دین کو چھوڑ دینا ہوا۔ ایسے لوگوں سے بحث نہیں، وہ خود اپنے ذمہ دار ہیں۔

سیکولر ریاستوں کے متعلق میری قطعی رائے یہ ہے کہ وہاں ہمارے اوپر اصل ذمہ داری شہادت حق کی ہے، جہاں آپ یہ شہادت دے سکتے ہیں تو اپنے فرض سے سبکدوش ہیں۔ وہاں ہماری ذمہ داری دعوت جہاد کی نہیں ہے۔ قتال و جہاد کی ذمہ داری افراد کی نہیں ہے۔ یہ ذمہ داری اس وقت عائد ہوتی ہے جب اہل ایمان کی ایک منظم جماعت ہوتی ہے جو حکومت کرتی ہے، اپنا آئین بناتی ہے، قانون نافذ کرتی ہے، ان لوگوں کو جو دین اور شریعت کی خلاف ورزی کرتے ہیں سزا دیتی ہے، اپنی فوج منظم کرتی ہے اور ضرورت پڑے تو دشمن سے مقابلہ کرتی ہے۔ افراد کی یہ ذمہ داری نہیں ہے۔ سیکولر حکومتوں کا دعویٰ یہی ہے کہ آپ کو ان میں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ وہاں بات شہادت حق ہی تک محدود رکھنی چاہیے۔ اگر آپ نے اقامت دین یا قتال کا حکم دے دیا تو آپ شہادت حق کا امکان بھی ختم کردیں گے۔ آپ کی ذمہ داری یہ نہیں کہ آپ وہاں جہاد کا وعظ کریں۔ اس وقت بعض لوگ ایک آفت بنے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے کوئی بھی اپنا دروازہ کھولنے کے لیے تیار نہیں، جو دروازے کھلے ہوئے تھے تو اب تک جو تجربات ہوئے ہیں ان کی روشنی میں کہا جاسکتا ہے کہ ان کے لیے بقیہ دروازے بھی بند ہوجائیں گے۔

افغانستان میں مجاہدین کی جدوجہد:

سوال: کیا افغانستان میں مجاہدین کی جدوجہد اسلامی جہاد کے ذیل میں آتی ہے؟

(یہ سوال افغانستان پر روسی حملے کے زمانہ کا ہے۔ مدیر)

جواب: افغانستان میں مجاہدین گوریلا جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ وہاں روسیوں کے حملہ کے بعد جو صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس سے عہدہ برا ہونے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ لوگ جان کی بازی کھیل کر اپنی جان، عزت و ناموس کو بچائیں۔ آخر عزت و ناموس کو اور اپنے جان و مال کو بچانا دین میں داخل ہے کہ نہیں؟ رہے افغان مہاجرین، تو مہاجرین اصل میں وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے دین کے معاملہ میں تشدد و ایذا (Persecution) سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کسی ایسے ملک کی طرف ہجرت کرتے ہیں جہاں ان کو اپنے دین وایمان کا تحفظ ملے۔ افغان مہاجرین کے معاملہ میں وہ مثالی شکل تو موجود نہیں ہے تاہم یہ اپنے دین اور عزت و ناموس کو بچانے ہی کے لیے اپنے ملک سے نکلے ہیں۔ ان کی شامت تو نہیں آئی تھی کہ اپنا گھر در چھوڑ کر آپ کے ہاں آکر ڈیرے ڈالتے۔ اس موقع پر آپ نے ان کی مدد کی ہے تو یہ انسانی خدمت اور مدد کے تصور کے تحت بہت مبارک کام ہے۔ دین کا شعور واحساس جتنا بھی ہو مبارک ہے۔ جو لوگ وہاں لڑ رہے ہیں تو موجودہ حالات کے تحت گوریلا وار ہی کر سکتے ہیں اور یہ بھی جنگ ہی کی ایک شکل ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ کی مدد ان کو حاصل ہو اور اللہ تعالیٰ ان کو فتح دے۔ جہاں تک کمیونسٹ تحریک کے مقاصد کا تعلق ہے: دین دشمنی اور دین کو ختم کرنا اس کا اصولی موقف ہے۔ تو اس معاملہ میں ایک مسلمان جو بھی کچھ کرے گا وہ انشاءاللہ دین کی خدمت ہوگی۔

مال غنیمت کی تقسیم کا حکم:

سوال: مال غنیمت کی تقسیم کا قرآنی حکم جدید بین الاقوامی قوانین سے میل کھاتا معلوم نہیں ہوتا تو کیا آج کل یہ قانون ساقط سمجھا جائے گا؟

جواب: اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانہ میں مستقل فوج (Standing Army) ایک ناگزیر ملکی ضرورت ہے۔ جنگ کا معاملہ ایک بہت بڑا فن بن گیا ہے۔ اب لوگوں کو جز وقتی طور پر بلا کر ٹریننگ نہیں دی جاسکتی۔ صرف وہی فوج کام کر سکتی ہے جو ایک نظم کے تحت طویل عرصہ تک فن جنگ کے مختلف شعبوں میں مہارت حاصل کرتی ہے۔

اس زمانے میں معاوضہ فوج کو ضرورت سے زیادہ ہی ملتا ہے۔ معقول تنخواہ، وردی، سواری اور دیگر سہولتیں ان کو دی جاتی ہیں۔ تربیت بھی ان کو درجہ بدرجہ دی جاتی ہے اس لیے کہ نئے اسلحہ ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ اس لیے اب مال غنیمت کل کا کل اللہ اور رسول کے لیے ہوجائے گا، یعنی اجتماعی فنڈ میں چلا جائے گا۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے صدقات مقرر کردہ آٹھ مدوں میں سے ضرورت کے مطابق بعض مدوں کو خاص کرنے اور بعض کو معطل کرنے کی گنجائش ہے۔ رہ گئے جنگ کے متعلق بین الاقوامی قوانین تو

ان کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ ان میں کوئی قانون ایسا نہیں ہے جو اسلام کے منافی ہو بلکہ یہ ہے کہ اسلام جہاں تک اس قانون کو ترقی دینا چاہتا تھا یہ تقریباً اسی رخ پر جا رہا ہے۔ اب اگر اس پر پوری طرح عمل نہیں ہو رہا ہے تو یہ لوگوں کی نالائقی اور بین الاقوامی قوانین کی توہین ہے۔ مال غنیمت کے حصول اور تقسیم سے متعلق بھی بین الاقوامی قانون جتنا ہے ہم اس کا احترام کریں گے، کوئی چیز اس میں اسلام کے خلاف نہیں ہے۔

علیٰ ہذا القیاس، لونڈی غلام کے مسئلہ میں بین الاقوامی قانون میں جو ترقی ہوئی اور غلامی کے سسٹم کو ختم کر دیا گیا تو یہ عین منشائے اسلام کے مطابق ہے۔ اب اگر کوئی یہ چاہے کہ ہم اس غلامی کے حکم کو اسلام کے احیاء کے مقصد سے دوبارہ زندہ کریں گے تو یہ ایک غلط موقف ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام نے غلامی کے سسٹم کو اگر برداشت کیا تو یہ اس وقت کے بین الاقوامی حالات کے تحت مجبوری تھا۔ البتہ اسلام نے یہ کیا کہ اپنے نظام میں غلاموں کی مدد اور ان کی اصلاح اور حقوق کے لیے ایک ضابطہ بنا دیا اور بتدریج اس کے خاتمے کی طرف رہنمائی دے دی۔

انفاق کی بہتر صورتیں:

سوال: انفاق فی سبیل اللہ کی اس وقت بہتر صورت کیا ہو سکتی ہے؟

جواب: اس سوال میں کوئی مشکل تو نہیں ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ کے لیے آگے پیچھے، دائیں بائیں دیکھیے۔ بہت سارے لوگ ہیں جن کو ہم جانتے ہیں کہ ان کو مدد کی ضرورت ہے، ان کی مشکلات ہیں۔ تو میرے نزدیک اول مصرف ان لوگوں کی مدد ہے۔ یہ لوگ وسائل اور ذرائع بھی نہیں رکھتے۔ اس کے بعد ملت کے مفاد کے جو بہت سارے کام معاشرے میں ہو رہے ہیں ان میں بھی خرچ کر سکتے ہیں اور اگر کبھی جنگ وغیرہ کی خدمت آ گئی تو اس میں بھی مال خرچ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تمام خرچ فی سبیل اللہ ہی ہوگا۔

پوری جائیداد فی سبیل اللہ دینے کا حکم:

سوال: کیا انسان اپنی زندگی میں اپنی ساری جائیداد فی سبیل اللہ دے سکتا ہے جب کہ ورثا خود کفیل ہوں؟

جواب: ایک انسان اپنی زندگی میں اپنی جائیداد میں شریعت کے حدود کے اندر ہر تصرف کر سکتا ہے اور چاہے تو بیچ بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر جائیداد چھوڑ کر مرے گا تو شریعت کے مطابق تقسیم ہوگی۔ رہ گیا اپنی زندگی میں انفاق فی سبیل اللہ تو اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انفاق ایک ثلث سے زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ ورثا اس پوزیشن میں ہیں کہ خود کفیل ہیں تو سارا مال انفاق میں دے ڈالوں۔ بعض صحابہؓ نے ایسا کرنا چاہا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کو ایسا کرنے سے روکا۔ البتہ اگر ورثا خود اس بات کی اجازت دے دیں تو پھر کل جائیداد انفاق کرنے میں حرج نہیں ہے۔

(ترتیب: سید اسحاق علی)

نئی اشاعت

تفسیر قرآن کے اصول

تالیف :- امام حمید الدین فراہیؒ — ترجمہ و ترتیب :- خالد مسعود

موضوعات

1- قرآن میں تدبر و تفکر کی اہمیت
2- قرآن مجید کی ترتیب
3- قرآن۔ ایک مربوط و منظم کتاب
4- اصول تفسیر کو مدون کرنے کی ضرورت
5- اصول تفسیر سے متعلق چند تمہیدی مباحث
6- تفسیر قرآن کے اصول
7- اصول تاویل

قیمت -/80 روپے

اصول فہم قرآن

مصنف :- مولانا امین احسن اصلاحی — ترتیب :- عبداللہ غلام احمد

موضوعات

- فہم قرآن کے لیے چند بنیادی اصول
  1- قرآن مجید کی دعوت عقل و فطرت پر مبنی ہے۔
  2- قرآن مجید کی ترتیب اتفاقی نہیں بلکہ توقیفی ہے۔
  3- قرآن حق و باطل کے امتیاز کے لیے کسوٹی ہے
  4- قرآن مجید قریش کی ٹکسالی عربی زبان میں نازل ہوا۔
  5- قرآن قطعی الدلالہ ہے۔
- نسخ اور اس کی حکمت
- حکمت قرآن کے فہم کے لیے اساس

قیمت -/34 روپے

اسباق النحو

مصنف :- خالد مسعود

- امام فراہیؒ کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف
- ترجمہ کے لیے مشقیں

قیمت -/36 روپے

"میرے نزدیک یہ کتاب طلبہ فن کے لئے کافی ہے۔ اس سے عربی زبان و عربی زبان سیکھنے کی راہ باز ہو جائے گی"۔ مولانا امین احسن اصلاحی

ملنے کا پتہ

1- ادارہ تدبر قرآن و حدیث۔ رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد، لاہور۔
2- دار التذکیر۔ رحمان مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔